# طبقات

مطالعہ      مشاہدہ      تجربہ

زندگی اور اُس کے مختلف پہلوؤں پر تنقید و تبصرہ

علم و عمل کے لئے بصیرت افروز اشارات

•
•
•

احسان دانش

مکتبۂ دانش
ایبٹ روڈ
انار کلی

۷۸۶

# طبقات

مُطالعہ — مُشاہدہ — تجربہ

اصُولِ فطرت کی روشنی میں

زندگی اور اُس کے مختلف پہلوؤں پر تنقید و تبصرہ

اور

عِلم وعمل کے لئے بصیرت افروز اشارات

احسان دانش

مکتبہ دانش — مزنگ لاہور

# طبقات

(جلد اوّل)

مطبع ——— لاہور آرٹ پریس انارکلی لاہور

تعداد ——— پانچ سو جلدیں

قیمت ——— چار روپے آٹھ آنے

تاریخ طباعت ——— ۲۱ نومبر ۱۹۵۲ء

مکتبۂ دانش مزنگ لاہور پاکستان

# انتساب

اردو ادب کے محسن

جناب نواب مشتاق احمد گورمانی

کے نام

ا۔ ص۔ ک۔ دانش

# تشکّر!

یوں تو میں ہر اُس شخص کا ممنون ہوں جس سے مجھے ایک لفظ ایک خیال، ایک اشارہ، یا ایک سبق بھی ملا ہے۔ لیکن جہاں تک قابلِ ذکر لوگوں کا تعلق ہے ان کی تعداد مولانا تاجور مرحوم، حضرت نیاز فتحپوری، مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر برہان احمد فاروقی اور جناب پروفیسر امیرالدین تعدادی سے آگے نہیں بڑھتی۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جن میں ہر شخص اپنی جگہ ایک ادارہ ہے۔ اس کتاب کے بعض مسائل پر انہیں لوگوں سے گفتگو رہی ہے۔ اور انہوں نے ہی مجھ جیسے ضدی انسان کو مطمئن کیا ہے۔ ورنہ ماڈرن لوگوں میں انگریزی تعلیم یافتہ پروفیسر اور قدیم طرز کے زاہدان ایسے کہاں؟

ان کی تو پیشتیں ملی ہوئی ہیں اور ان کی یک رُخی تعلیم سے انسانی زندگی بھٹک تو سکتی ہے مگر راہِ راست پر نہیں آسکتی —— کیونکہ ان کا علم حاسد ہے اور مذہب متعصب! —— وہ انسانی ضمیر کے لوہے کو آنچ دے کر موڑنا چاہتے ہیں جس سے پوری زندگی بے آب ہو جاتی ہے۔ اور بات صحیح مقصد تک نہیں پہنچتی۔

احسان دانش

# افتتاحیہ

(از : سید محبوب الرحمٰن صاحب واثق عظیم آبادی)

زیر نظر کتاب "طبقات" کی اہمیت سے کیسے انکار ہو سکتا ہے۔ لیکن اُردو ادب میں احسان دانش کے نام سے اس کتاب کا اضافہ کوئی تعجب خیز بات نہیں۔ احسان دانش کا طریق فکر اور اسلوب بیان ہمیشہ اچھوتا اور جُدا رہا ہے۔

ترقی پسندی کے اگر صحیح نمونے دیکھنا مقصود ہوں تو اوّل سے آخر تک احسان دانش کی تصانیف دیکھ لیجئے۔ اپنی نظموں میں وہ مناظر دکھا کر سامعین کے دماغ کو ایسے مقام پر لے جاکر چھوڑ دیتا ہے جہاں امیر ہو یا غریب، حاکم ہو یا محکوم رعایا ہو یا شاہ ہر شخص ایک فیصلہ کن مرحلہ پر آ جاتا ہے اور اپنے آپ کو کسی نہ کسی ذاتی فیصلہ پر پہنچنے کے لئے مجبور پاتا ہے۔ اور ایسے ہی لٹریچر سے دل و دماغ میں رفتہ رفتہ بلند پروازی اور دُور رسی کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔

احسان دانش کی خصوصیات میں نئے اسلوب بیان ہی نہیں بلکہ اس نے اُردو کو بہت قدر نئے الفاظ، استعارات تشبیہات اور محاکات۔ دیئے ہیں کہ نئی نسلوں کی تحقیق کے لئے وہ اور اس کا ادب ایک دلچسپ موضوع قرار پائے گا۔

جہاں تک ہنگامہ پروری اور گروہ آرائی کا تعلق ہے احسان اس سے کوسوں دور ہے۔ وہ اپنے لٹریچر سے ذہنوں میں صاف ہوا کے دریچے کھولتا ہے جس سے ہر شخص کی فطرت میں ذوقِ مشاہدہ کے ساتھ ساتھ جدید رجحانات اور نئے سوالات کے سرچشمے ابلنے لگتے ہیں۔

مناظر کی عکاسی کے معاملہ میں اس کی نظر "عکس ریز" سے کم نہیں اور محسوسات کے باب میں معمولی سے معمولی رمق اس کے دل و دماغ پر طوفانی شورشوں سے گزرتی ہے۔

نثر میں اس سے پہلے اس کی ایک کتاب "روشنیاں" بھی چھپ چکی ہے۔ جو حقیقی معنی میں زندگی کے مختلف شعبوں میں مشعلِ راہ سے کم نہیں کیونکہ مصنف نے اس میں یہ کوشش کی ہے کہ تجربہ کے بغیر ہر انسان کو زندگی کے صحیح نتیجے دے دیئے جائیں۔ "طبقات" بھی اسی قسم کی تفصیلی کوشش ہے جس میں ہر عنوان پر وضاحت اور صفائی سے ایسی روشنی ڈالی گئی ہے کہ خشک سے خشک موضوع دلچسپ ہوکر رہ گیا ہے۔

احسان دانش کی معاشی زندگی اب تک ویسی ہی ہے جیسی ہمیشہ سے صاحب فن لوگوں کی گذرتی چلی آئی ہے۔ وہ اب تک افلاس کے جبڑوں سے نہیں نکلا لیکن کبھی اس کی زبان پر اس کا شکوہ نہیں آیا اُسے جب دیکھئے جدوجہد میں مبتلا ہے۔

اس کی زندگی اگرچہ ایک معمولی انسان کی زندگی ہے لیکن اس میں ایسے ایسے گوشے ہیں کہ ہر طبقے کے لئے فلاح کا معاد رکھتے ہیں۔

اب تک نامور لوگوں کی سوانح عمریاں چھپتی چلی آرہی ہیں لیکن کسی نے کسی معمولی

زندگی کی اہمیت کو ابھی تک نہیں سمجھا۔ اور حقیقت میں وہی زندگیاں رہنمائی کرتی ہیں آنیوالی نسلوں کی۔

احسان دانش کے کردار کا یہ عالم ہے کہ جب بھی اسے سوانح عمری لکھنے کے لئے کہا گیا تو یہی جواب ملا کہ بدنصیبی سے میرے ملک میں صاحب بصیرت لوگ کم ہیں اور کوتہ اندیش زیادہ۔ مبادا وہ اسے بھی میری طرف سے رحم کی درخواست تصور کرلیں اور میرے غرورِ افلاس پر پانی پھر جائے۔

احسان دانش انتہا درجے کا نازک مزاج مگر محنت جان انسان ہے، وہ دل میں ہزاروں زخم رکھتا ہے مگر اپنے ہونٹوں کے تبسم کو مرجھانے نہیں دیتا۔ اس کی آواز میں ایک مردانہ کڑک اور لہجے میں بے نیازی مستقل ہو گئی۔ وہ بڑی سے بڑی مشکل اور مصیبت میں بھی اسی انداز سے گفتگو کرتا ہے جیسے کوئی بات ہی نہیں۔

اس کتاب میں جگہ جگہ اس کی زندگی کی جھلکیاں موجود ہیں۔ وہ جن مراحل سے گذرا ہے اس سے گھبرایا نہیں وہ زندگی کے ہر نشیب و فراز سے دلچسپی لے کر متعارف ہوا ہے۔ اور وہی سرمایہ زمانے کو تقسیم کر دیا ہے۔

اس کی نظر غور وہ گر ہے اور دل غور و فکر کا خوگر اور یہی شناخت ہے ایک حقیقی ادیب اور شاعر کی۔!

اگر یہ کتاب مقبول ہوئی تو اس کی دوسری جلد زریں مستقبل کا ایک پیغام ہے جس میں شعلے ہی شعلے ہیں، روشن، ٹھنڈے اور معطر۔

ورنہ جہاں اس اندھے اور بہرے ماحول میں اس کی اتنی زندگی اپنے علم و ادب اور شعر و نغمے کے ماتم میں گذری ہے اور سہی۔

سید نسیب الرحمٰن واثق عظیم آبادی۔ ۳ جون ۱۹۷۰ء

# فہرس طبقات


| عنوان | صفحہ | عنوان | صفحہ |
|---|---|---|---|
| واپسی | ۱۳ | مزدور، کلرک، کسان اور سپاہی | ۶۸ |
| ربِ اضداد | ۱۵ | خیرات | ۷۴ |
| پیغمبر | ۲۱ | سمندر | ۸۰ |
| آزاد مشرب | ۲۴ | عورت | ۸۳ |
| انسان سے | ۳۲ | حقائق | ۸۹ |
| زندگی | ۳۸ | اکھاڑا | ۹۲ |
| جہاد | ۴۵ | دانائی | ۹۸ |
| ادبی وراثت | ۵۰ | ذاتیات | ۱۰۱ |
| انتخاب | ۶۱ | (دوسرا باب) | ۱۰۸ |
| محبت | ۶۳ | ہمدردی | ۱۱۱ |
| نیکیوں کی ماہیت | ۶۶ | غلامی کی خصوصیات | ۱۱۴ |

اشارات ۔۔۔۔۔۔ ۱۲۰

لکھے پڑھے عوام طلب ۔۔۔۔۔۔ ۱۲۲

دوستی ۔۔۔۔۔۔ ۱۲۴

مفاد پرست ۔۔۔۔۔۔ ۱۲۶

درمیانہ طبقہ ۔۔۔۔۔۔ ۱۳۲

تعلیم وتربیت ۔۔۔۔۔۔ ۱۳۵

اونچی تجارت ۔۔۔۔۔۔ ۱۴۱

جھوٹ ۔۔۔۔۔۔ ۱۴۵

کسان ۔۔۔۔۔۔ ۱۴۸

جزویست از پیغمبری ۔۔۔۔۔۔ ۱۵۰

عوام ۔۔۔۔۔۔ ۱۵۸

انجام؟ ۔۔۔۔۔۔ ۱۶۲

درست پیشہ ۔۔۔۔۔۔ ۱۶۶

اے تازہ واردان بساط ۔۔۔۔۔۔ ۱۶۹

آزادی ۔۔۔۔۔۔ ۱۷۳

نااہلی ۔۔۔۔۔۔ ۱۷۷

بٹیر چال ۔۔۔۔۔۔ ۱۸۰

شعروادب ۔۔۔۔۔۔ ۱۸۴

نیکیوں کی سیر ۔۔۔۔۔۔ ۱۹۳

قیادت ۔۔۔۔۔۔ ۱۹۷

حُسن ۔۔۔۔۔۔ ۲۰۲

عِشق ۔۔۔۔۔۔ ۲۰۷

بوڑھے ۔۔۔۔۔۔ ۲۰۹

جائزے ۔۔۔۔۔۔ ۲۱۱

تحریک ۔۔۔۔۔۔ ۲۲۴

شِکار ۔۔۔۔۔۔ ۲۲۶

غداری ۔۔۔۔۔۔

موت ۔۔۔۔۔۔

# واپسی

دُنیا نے جو مجھے بالاقساط دیا ہے۔ مَیں اُسے
یکمشت واپس کر رہا ہوں۔

احسان دانش

# ربِّ اضداد

ربّ اضداد تک پہنچنے کے لئے انسان حقائق کے بیکران سمندر اور معرفتوں کے بے شمار دریا ابھی کیسے عبور کر سکتا ہے جب کہ اس کی عمر دروازے سے نکل کر سامنے والی چورگلی کے نکڑ پر ختم ہو جاتی ہے۔ عمر کے اندازے میں آجانے والا خالق اپنی مخلوق سے پہلے ختم ہو جاتا ہے اور شاید انسان ختم نہیں ہوتا۔ یہ الگ بات ہے کہ انسانیت کی کمی کے باعث بسا اوقات آدمی خدا کا قائم مقام انسان ہی کو قرار دے لیتا ہے۔ کبھی روحانی اور جذباتی مجبوریوں سے، کبھی مقاصد کے خوابوں سے مگر جب رات کی دُلائی پر گجر کی آواز روشنی ڈالتی ہے تو یہ بندگانِ محبتِ مقاصد کہیں تو گھروں میں چھپ چھپ کر رہتے

ہیں اور کہیں اِن کے چوٹل ضبط خانقاہوں میں اڑا دیتے ہیں۔

جب یقین صحت مند نہیں ہوتا اور ارادوں کے پاؤں سُوج جاتے ہیں تو انسان نگر کے میدان میں سفر کرنے سے ڈرنے لگتا ہے۔ حالانکہ وہاں کی آب و ہوا سے ایمان کے پھیپھڑے مضبوط اور یقین کا معدہ قوی ہوتا ہے۔

ربِّ اضداد کی اس خردمند مخلوق میں دو جماعتیں ہیں۔ ایک عزائم کے پل پر زندگی بسر کرتی ہے، دوسری عقیدت کے دریچوں میں؛ ان دونوں میں کِس کو گمراہ کہا جائے جب کہ ان کا خالق محیط بھی ہے اور قادر بھی۔ علاوہ ازیں منزل دونوں کی ایک ہی ہے۔

جسم ایک پُل ہے جس کے ایک طرف انسان ہے اور دُوسری طرف خدا کی معرفتیں۔ جب انسان اس پل سے گزرتا ہے تو عبودیت کی آہ و زاری اس کی گونج میں گم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ یہ پُل کھوکھلا ہے اور بجنے والی دھات کا، جو لوگ اس سے چُپکے چُپکے دبے پاؤں گزرتے ہیں اُنہیں معرفتوں سے بغلگیر ہوتے سُنا گیا ہے۔

اس پُل کی چوکیوں اور کونے کھدروں میں زندگی بسر کرنے والوں کی نیکیاں کاہل اور بدیاں کینہ پرور ہوتی ہیں۔

جسم کے بارے کبھی کبھی یہ آوازیں آتی ہیں کہ دماغ زمین پر پھیلاتے

کی چیز ہے اور دل آسمانوں کے سفر میں کام دیتا ہے۔ آنکھیں اور ہاتھ پہاڑوں کے دلوں پر نشتر لگانے اور سمندر کی تہوں میں آکسیجن دینے کیلئے ہیں۔ علاوہ ازیں بحرپیمائی اور ستارہ شناسی کے لیئے۔

جب انسان کے حواس سنبھالا لیکر ذرا قائم ہوتے ہیں تو ہزاروں شبہات وشکوک کے ساتھ تل چاولے۔ خیالات ایسے بھی آتے ہیں جن میں محبت، نفرت، عشق، رقابت، نظر، ادراک اور ارادوں کے خالق کا تجسس ہوتا ہے مگر عموماً جہالت کا بوجھ اور علم ہمتی کی دلدل قائم گیر ہو جاتی ہے لیکن تا بہ کے؟

کیا آج کے حیوان اکثر انسانوں سے بلند نہیں کیونکہ وہ انسان کو اپنے سے بہتر وراثت دیتے چلے آرہے ہیں اور یہ دور اب روحانی اور حقیقی طور پر کائنات کو اپنے سے بہتر انسان نہیں دیتا۔

اس میں شک نہیں کہ اس تخلیق کے دریا میں ایک دو طوفانی موجیں ایسی بھی آئیں گی جن میں ایک دو بہت بلند انسان آئیں گے لیکن ان کا تعلق ارتقاء سے نہیں، وہ تو ہے فطرت کا ایک وعدہ جسے انسان بھانپ گیا ہے اور وہ ہدایت یافتہ ہوں گے نہ کہ ہادی اور نئے شارع!

اس کے باوجود انسان کا مقام کائنات میں سب سے بلند ہے کیونکہ یہ عناصر کی معراج اور ارتقاء کے کمال کا آئینہ دار ہے۔ جس قدر آدمی

نظر آتے ہیں ان میں کچھ تو قیمتی اور عظیم المرتبت انسانوں کے تجربے ہیں۔
اور کچھ مذہب کے پرستاروں کی کارین کا پیاں کچھ مجاہدوں کے دھندلے
خاکے اور کچھ حکماء کے خوش پوش ڈھلے نتیجے مگر ان کی اخلاقی فردوں
اور عملی دفاتر میں نیکیوں کے خانے موجود ہیں اور ان کے نتیجے میں سزا و
جزا بھی لیکن ان کی نظر مرکزی تعلیم اور اساس انسانیت پر نہیں پڑتی۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کوئی صاحب وحی اور حامل الہام
ایسا بین الانسانی قانون لے کر نہیں اُترا کہ کائنات کو یکساں طور پر
تسکین دے کر مطمئن کر دے۔

اس قسم کے لوگ فلسفۂ تضاد سے بے بہرہ ہیں اگر وہ ذرا اس
رُخ پر غور کریں کہ ہر چیز اپنی ضد پر قائم ہے تو رب اضداد کا یہ کشمکشی
نظام حیات دائرہ ربوبیت سے باہر نظر نہیں آئے گا!

اسے اعتدال میں رکھنے کے لئے الہامی کتب کے نزول اور پیغمبروں
کے ورود سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ پیغمبرانہ قیادت میں تنقید
کی گنجائش نہیں ہوتی اور وہ ہر تضاد میں ایک طرف کے ظاہری اور
دوسری طرف کے باطنی اوصاف کو ہم آہنگ کر دیتا ہے۔

یہی وجہ تھی کہ آخری پیغمبرؐ کے گداز سینے سے نکلا ہوا آوازہ کائنات
کے گوشہ گوشہ میں گونج گیا اور فقیروں کی جھونپڑیوں سے لے کر

بادشاہوں کے محلات تک بیدار ہو گئے اور عرب جیسا وحشی و گمراہ ملک ایک آفاقی اور اجتماعی ذہن کا نمائندہ اور تہذیبِ حیات کا پیشرو بن گیا۔

اگر آج بھی اسی قیادت کو معتبر سمجھا جائے اور اس یقین سے زندگی کے ہر گوشہ پر ذاتی اغراض کو نظرانداز کر کے سوچا جائے، تو بصیرت کے آئینے صاف اور دلوں کے جوہر تابناک ہو سکتے ہیں۔ جن سے سینوں میں گداز اور عزائم میں استحکام ضروری ہے!

الہامی کتاب اور پیغمبر دونوں کی تعلیم میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ اس کے مسلسل مطالعہ سے انسان ذہنی طور پر اس قدر بلند ہو جاتا ہے کہ وقت کے ارتقائی تیور اور انقلاب کے مہیب آثار دیکھ کر اپنے معاشی، اقتصادی اور اخلاقی قوانین مرتب کر لے۔

وحی والہام کو زندگی کا محافظ نہ سمجھنا، کاہل اور بے عمل مغرب زدہ اربابِ نشاط کا نظریہ تو ہو سکتا ہے لیکن اسلامی ذہنیت کا نام نہیں پا سکتا۔

الہامی کتاب انسانوں کے لئے اترتی ہے نہ کہ بے دماغ جانوروں کے لئے اور جب اس کے نزول میں انسانیت شرط ہے، تو اس کی رہنمائی میں قوانین سازی بھی تو انسان ہی کا کام قرار پاتا ہے۔

اتنا ضرور ہے کہ ہر مادیاتی نظامِ فکر کے نتیجے میں ایک گوشہ رہ جاتا ہے جو سائنٹیفک اصولِ حیات کا ساتھ نہیں دیتا اور وہ ہے مادّہ سے ماوری نظام جس کا ایک اسکول علیحدہ ہے اور وہ اس مادیاتی نظام کو اپنے نظام کار کا دیباچہ بتاتا ہے۔

اہلِ سائنس اس کے بارہ میں صرف اس قسم کے اظہارِ خیال پر اکتفا کر جاتے ہیں کہ ہر مادّہ تقلیل کے تسلسل میں آکر تحلیل کی چیز ہو جاتا ہے۔ الہامی کتاب سے پیغمبر کا ہم آہنگ ہونا ضروری ہے اور متبعین کا کام پیغمبر کی تعلیم اور الہامی احکام کے مقابلے کے بعد عملی جدّ و جہد کے سوا کچھ نہیں۔

اگر آج اس تجزیے پر عمل کیا جائے تو اب تک کے رہنماؤں پر تنقیدی نظر ڈالنی ہوگی۔ جس کا نتیجہ وہ انقلابی پروگرام ہوگا جو اپنے دامن میں ایسی زندگی رکھتا ہے جو ہر قسم کے خوف و ہراس سے بلند اور موت کے ہر سائے سے بے خطر ہے!

○

# پیغمبر

کوئی پیغمبر ماضی سے مفقود نہیں ہوتا۔ اس کے دل پر مستقبل کے پرتو صفائی سے عکس ڈالتے ہیں اور اس کا دماغ حال کی اصلاح کے ساتھ مستقبل کے تعمیری پروگرام مرتب کرتا ہے۔

تجربے اور علم کے لحاظ سے پیغمبر کا کوئی استاد نہیں ہوتا کیونکہ اُسے تو فطرت اپنا ترجمان بنا کر بھیجتی ہے اور اس قسم کا ترجمان دُنیاوی اساتذہ کے پایاب علم سے بلند درجہ رکھتا ہے۔

پیغمبر کی زندگی میں جھوٹ اور خیانت کی تاریکی نہیں ہوتی، وہ تشدد سے مرعوب اور تلطف سے مجبور نہیں ہوتا وہ تو صرف صداقت کا دلدادہ اور حقائق کا قاسم ہوتا ہے۔

پیغمبر کوئی بات گمان اور قیاس کے بل پر نہیں کہتا بلکہ اس کی تعلیم فطرت کا تقاضا اور ارتقاء کی فصل ہوتی ہے۔

پیغمبر کی تعلیم زمان و مکان کی قیود و حدود تک نہیں ہوتی بلکہ اس کی حکمتیں وقت کے ساتھ ساتھ نکات آفرینی کرتی جاتی ہیں۔ جن کی روشنی

میں انسانی قدریں قیمت پاتی ہیں۔

بعض لوگوں کا اعتراض ہے کہ لاکھوں پیغمبروں کی کیا ضرورت تھی جبکہ خدا ئے کائنات کو انسانی ضرورتوں کا علم تھا کیوں نہ پہلے پیغمبر ہی پر دینِ فطرت اور نظامِ حیات مکمل کر دیا!۔

انہیں یہ معلوم نہیں کہ کائنات اور کائنات کے ساتھ انسانی اذہان نے ارتقائی مدارج طے کئے ہیں اس لئے انسان کا آغازی دور ہرگز اس قابل نہیں تھا کہ مکمل قوانینِ حیات مرتب کر سکتا یا سمجھ سکتا۔

رفتہ رفتہ جب انسان اس قابل ہو گیا کہ آئینِ حیات میں اقتصادی، معاشی، اخلاقی عنوانات کی ضرورتوں کو سمجھ سکے اور آفاقی تشنگیوں کو بجھا سکے تو فوراً پیغمبری کا دروازہ بند ہو گیا! اور بند ہے۔

دینِ فطرت کے صحیفے اور پیغمبرانہ تعلیم میں اتنی لچک اور وسعت ہے کہ قیامت تک زندگی کے تمام تر پہلوؤں کو وقت کے تقاضوں کے ساتھ تعمیر کر سکے گا۔ اور اختتامِ کائنات تک ہر جہتی ترقیاں اس کی پہنائیوں کو عبور نہیں کر سکیں گی۔

پیغمبر کے اقوال اور الہامی کتاب کی تعلیم میں فصل نہیں ہوتا، وہ معانی اور مطالب کے لحاظ سے ہم رشتہ ہوتے ہیں۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ پیغمبر کے اقوال اور الہامی کتاب میں زندگی کے ہر شعبے کے لئے مفصل پروگرام دینے کی صلاحیت نہیں ہوتی تو

کیا اس سے انکار ہو سکتا ہے کہ پیغمبری اقوال اور الہامی کتاب کی روح معانی زندگی کو ہر قدم پر سنبھلنے کا اشارہ کرتی ہے۔ جس سے روح، ذہن، اخلاق، سیاست، حکومت اور حفظانِ صحت کی راہیں صاف اور سیدھی ہو جاتی ہیں۔ اور انہیں راہوں کے مسافروں کی جد وجہد تاریخ کہلاتی ہے۔

صرف عبادت کے طرز وطریق اور عقائد کے ٹھنڈے سائے اقتصادی اور معاشی مشکلات کو حل نہیں کر سکتے اور نہ کہیں وحیِ الہام میں اس کے شواہد ملتے ہیں۔ بلکہ عقائد اور عبادت کے طرز وطریق ہی میں سیاسی، معاشی اور اخلاقی نکتے بھی ہیں۔ اور یہی نکتے دائرہ عمل میں آکر زندگی کی کامیابی کے ضامن قرار پاتے ہیں۔

جو اصولِ حیات قابلِ عمل نہیں ہوتے وہ باطل کے سانچے سے نکلتے ہیں اور ارتقائے کائنات کی ٹھوکروں میں چکنا چور ہو جاتے ہیں۔ انہیں حادثات کو تاریخ میں ناکامی کا عنوان دیا جاتا ہے۔

○

# آزاد مشرب

آزاد مشرب انسان کے دامن میں حقائق ہی حقائق اور معارف ہی معارف ہیں اور اسی تخصیص کی بنا پر یہ مذہب نہیں بلکہ دینِ فطرت کی تعریف میں آتا ہے۔ آزاد مشرب غیر مرئی طاقتوں سے مادیات پر حکومت کرتے ہیں اور الجھے ہوئے لوگ مادیات سے غیر مادی سلوک چاہتے ہیں وہ یہ نہیں سمجھتے کہ مادہ بذاتِ خود تحلیل ہو جانے والی چیز ہے۔

خدا سے منکر وہ لوگ ہیں جو مرکزیت کی طرف رجوع نہیں کرتے بلکہ اپنی روح کے ذرّے کو روحِ کامل سے جدا ہونے کے باوجود کامل خیال کرتے ہیں حالانکہ کامل سے علیحدگی خامی و ناتمامی سے منسلک ہونے کا نام ہے اور خام و ناتمام کا پستیوں پر اکتفا کرنا رفعت پسندی نہیں۔ وہ علم کی کمی اور بصیرت کی خامی کے باعث دُوسرے ادراک کے کچے ڈھانچوں اور تصوّرات کے ناقص بتوں کو سنگِ میل سمجھ لیتے ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ ہر کلیہ اپنے سے بلند تصوّر کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

جو بلندیوں کی طرف پر نہیں تولتا وہ پستیوں کی پیداوار میں کھو

کا کام دیتا ہے اور اس میں نہ جانے کتنی گردشوں کے بعد قوّتِ پرواز آتی ہے کیونکہ اس کی تربیت میں آزاد ہاتھ نہیں ہوتے اور ان کے معدوں میں غلامی کے تھنوں کا دُودھ ہوتا ہے۔

انسانوں میں کیاریاں بنانے والے بھرے مقابر اور زمین و آسمان کے درمیان شرمندہ ہو کر مسکراتے والے سنہری کلس اپنی معراج پر پہنچ چکے ہیں۔ لیکن ابھی تک وہاں یہ شعور تولّد نہیں ہوا کہ فطرت تنوّع پسند ہے اور اب وہ دن بہت نزدیک ہے کہ جھوٹے مذاہب اور خود غرض فرقوں کے چہرے اُتر جائیں گے ان کا جوڑ جوڑ چہ چہا رہا ہے جسے میں سُن رہا ہوں۔

آزاد مشرب اپنے مالک اور انسانوں میں حدِّ فاصل نہیں کھینچتا وہ تو فطرت کا لائحہ عمل ہے جس میں پھیلنے بڑھنے اور وقت کے مطابق آراستہ رہنے کی صلاحیتیں ہیں کیونکہ وہ روحِ کُل کا پیغام ہے، جو کائنات میں پھیلے ہوئے رُوح پاروں میں گونجتا ہے اور جھنجھناہٹ اجسام کے رگ و ریشہ میں لہرکھاتی رہتی ہے۔

ممکن ہے کہ کبھی اطمینان نے عقائد سے بھیک مانگی ہو لیکن جہاں تک بصارت کام کرتی ہے نظر کی آخری حد تک آثار و قرائن پھیلے نظر آتے ہیں جنہیں عقل تسلیم کرتی ہے اور ربِّ اضداد کا پتہ چلتا ہے۔

خدا کے معاملے میں اُن مقامات تک جانے کی نوبت نہیں آتی جہاں انسان عقلی طور پر خدا سے منکر ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ہر فکر کے بعد اسی ایک راستہ پر سکون کی چھاؤں ملتی ہے اگرچہ پگڈنڈیوں پر آبادیوں کے نام نہیں لکھے جاتے۔

بہت کم جانتے ہیں کہ خشک عقائد اور کھونٹوں سے بندھے ہوئے رسم و رواج اپنا منتہیٰ نہیں چھوڑتے۔ نشو و نما اور تسخیر کے ساتھ ساتھ ارتقاء دینِ فطرت کا سب سے بڑا خاصہ ہے۔

انسان کی بربریت ایک دن اُس کی غلط روی کو نڈھال کر دیگی اور پھر تھک کر محبت پر مجبور ہو جائے گا۔ موجودہ بے ایمانیوں اور ایمان فروشیوں اور حرام خوریوں کے بطن میں ایسے بچے کلبلا رہے ہیں جو اُن کے دشمن ہوں گے اور وراثتی عقائد سے متنفر!۔

مجبوروں اور ناداروں کے دل کی دبی ہوئی آگ میں عنقریب وہ ادراک پیدا ہو جائے گا جس سے اندھے ضمیروں کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور پھر انسان ناانصافی کی جھوٹی وکالت کو جرم قرار دے دیتا ہے اور پھپھوندی لگے ہوئے بودے مذاہب کے نظریات ناقابلِ قبول ہو جاتے ہیں۔

جو فطرت کے احکام پر عمل نہیں کرتا وہ دینِ فطرت کو ماننے کا

دعویٰ کیسے کر سکتا ہے؟ آزاد مشرب لوگوں کی روحیں اپنی دیواروں کے سایوں میں اونگھنے کی عادی نہیں ان کے جسم عمل سے جان نہیں چراتے!

جو لوگ دینِ فطرت کے قائل نہیں ان کی عقلیں اور دل کھڑکی کے آئینوں میں اشاروں سے متعارف ہوتے ہیں اور اشاروں میں ابہام ہی ابہام ہے!

وہ کبھی معانقہ سے بہرہ ور نہیں ہوتے کیونکہ ان کے سینوں میں صداقت کی وہ چیخ نہیں ہوتی جس سے آئینے چٹخ جاتے ہیں!۔

یہ مشرب زندگی کے خشک و بے آب صحرا میں شفاف پانی کا چشمہ ہے جو پیاسے اس تک پہنچ جاتے ہیں وہ پھر ادھر نہیں پلٹتے۔ لیکن عموماً اس کے راستہ میں ہر موڑ پر لاشیں ملتی ہیں اور ان کے سینے پر کم ہمتی، بد دیانتی اور غفلت کے افسردہ اور میلے تمغے

آزاد مشرب لوگ بادشاہوں سے نہیں دبتے وہ خدا کے سوا کسی کے سامنے جھکنا نہیں جانتے۔ وہ حق سے محبت کرتے ہیں۔ جس کا نتیجہ باطل سے جنگ ہے۔ وہ اطاعت کا مقام سمجھتے ہیں وہ ذروں پر توجہ نہیں دیتے بلکہ آفتاب پر لپکتے ہیں، ان کے کان طوفانوں کے نغموں سے نہیں اکتاتے اور ان کی نظر بگولوں کے ساتھ رقص کرتی ہے۔

وہ قبریں نہیں بناتے بلکہ روحوں کے محل اُٹھاتے ہیں اِس لئے ان کے ارادے موت کے سایوں سے دُور رہتے ہیں وہ عمل و تدبیر سے تقدیروں کے راستے ڈھونڈتے ہیں۔

ایسے لوگوں میں تعصب اور حسد جنم نہیں لیتا جن سے آئے دِن شیطان کی اُنجمنیوں میں اضافہ ہوتا ہے وہ تو مدّت ہوئی خود غرضی اور انسان دشمنی سے دست بردار ہو چکے ! وہ تو جہانِ عالم کو ایک دائرہ میں لاکر جسماً اور رُوحاً ایک کر دینا چاہتے ہیں آزاد مشربی یا دینِ فطرت کا اتّباع کسی خاص فرقہ یا مذہب کی ملکیت نہیں بلکہ جو جس رُخ پر جس قانونِ فطرت کا پابند ہو گیا وہ وہیں کامیاب و کامران ہو گیا۔

اور جس نے جس رُخ پر قانونِ فطرت سے روگردانی کی، وہ اسی مقام کی پستیوں میں دھنس گیا ! حق کی حمایت میں ایسے لوگوں کے تمام دعوے جھوٹے اور معارف کی پیروی میں بلند بانگی لازمی ہوتی ہے حق تو کسی رخ پر بھی باطل سے نہیں دب سکتا کیونکہ باطل مٹنے کے لئے پیدا ہُوا ہے اور حق زندہ رہنے کے لئے۔ یہی وجہ ہے کہ باطل کا شباب نظر افروز اور ایمان آزما ہوتا ہے اور حق اپنی سلامت روی میں اب تک ایک رفتار سے چلا آرہا ہے!

ہٰذٰن دنیا کے قلبی خطے میں ایک بار دینِ فطرت کا مکمل عکس پڑا تھا اور ایسا گہرا کہ ہر نقش جاندار و جاوید ہو گیا۔ لیکن یہ امانت تیسری نسل تک بھی محفوظ نہ رہ سکی اور باطل نے اپنے زرق برق ساز و سامان کے ساتھ ایسے جلوس نکالے کہ آزاد مشربی اور اس کا ضابطہ اس مقام پر نہ رہا جہاں سے زندگی کے ہر شعبے پر روشنی پڑ سکے!

لیکن چونکہ باطل فطرت سے اجازت نامہ لے کر نہیں نکلتا، اس لئے انجام میں میدان حق کے ہاتھ رہا۔ اتنا ضرور ہے کہ جعلی تجلیاں اور جھوٹے جھول بے شمار دلوں اور دماغوں پر اس طرح چھا گئے کہ تخریبی سایوں سے عقبیٰ کے نقش و نگار دھندلے پڑ گئے۔

اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ دینِ فطرت کے ماننے والے پستیوں میں رینگتے نظر آتے ہیں لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ یہ آزاد مشربی کا اثر ہے بلکہ یہ تو سزا ہے دینِ فطرت کا غلط اقرار کرنے کی۔

دینِ فطرت کا تو خاصّہ ہے کہ اذہان کے ساتھ ارادوں اور محکم ارادوں سے راہِ عمل میں تبدیلی          جس کا نتیجہ مفید اور آرائش آفریں ہوتا ہے۔ دینِ فطرت کے ماننے والے آزاد مشرب لوگوں نے اسے اب تک شاید اس طرح نہیں سوچا!

اس بے راہ روی اور بے قاعدگی کی زد میں آکر فقہ اور حدیث

جیسی حقیقتیں گرد آلود ہو گئیں اور عوام کے دل میں یہ یقین جگہ پکڑ گیا کہ دینِ فطرت اور اس کے احکام کو سمجھنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں یہ کسی کو خیال نہیں آیا کہ ازل سے لے کر ابد تک انسانی ترقیوں کی بنیاد دینِ فطرت پر رہے گی اور یہ وعدہ ہے الہامی!

اس مشرب میں فرقہ کی تخصیص جُرم اور انسانی تقسیم گناہ ہے۔ اگر دیکھا جائے تو فرقہ داری تو مرکزی خیال کے ہم آہنگ لوگوں کی اجتماعیت کا نام ہے، اور طبقاتی امتیازات ان کے فرعونی لبادے ان میں دو ہی قسم کے انسان پائے جاتے ہیں ایک تو اندھی تقلید کے رسیا دوسرے منکرین!

منکرین کا کوئی خاص عقیدہ نہیں ہوتا کیونکہ وہ تو اپنے عجز کو بے سہارے پا کر اپنی تشنگی اور تزلزل کا نام انکار رکھ لیتے ہیں جس میں تغیر و تبدل کا ہر وقت امکان ہے!

علاوہ ازیں نہ جانے کتنے مذاہب بنیادی عقاید و تصورات میں ہم آہنگ ہیں۔ لیکن اندازِ عمل کی بنا پر ہر جماعت اپنی صداقت سے آگے کامیاب نہیں!

مذاہب کے امتیازی حدود و شورشوں کے باوصف اس شعور کی رہنمائی سے عاری نہیں جو خباثت کائنات کی دہلیز تک رسا ہے

اور جن کے دامن تک اصل نجات اور ابدی راحت کی شعاعیں پہنچتی ہیں۔

یہ درست ہے کہ اس راہ میں سیکڑوں الجھاؤ اور ہزاروں پیچیدگیاں آتی ہیں۔ لیکن حقائق کی تلخیاں باطل کی شیرینی سے کہیں لذیذ ہوتی ہیں۔

اسمائے شریعت اور عنوانِ طریقت کے محدود اور محصور مفہوم کی جگہ اگر صاف دلی اور غیر جانب داری سے معانی اور مطالب نکالے جائیں تو اختلافات کے سارے سمٹ جانے کا امکان ہے!۔

اگر تعصب کی جگہ محبت اور دیگر اختلاف آفریں فروعات کی جگہ تحقیق و تنقید سے کام لیا جائے تو صرف الہامی کتاب کے احکام اور پیغمبرانہ قیادت باقی رہ جاتی ہے۔ جس میں تمام فرقے اور مذہب ایک مرکز پر آسکتے ہیں۔ اور آزاد مشرب لوگ ہمیشہ پیغمبر کے بعد کی ہر بے راہروی کو نظر انداز اور قیادت کو مشتبہ خیال کر کے اِس اصل سے گفتگو کرتے ہیں جسے منشائے فطرت کہا جاتا ہے۔

# انسان سے!

سورج کا تام جھام سر سے گذر جاتا ہے اور ستی کی ظلمتیں چھلک چھلک کر آسمان کے نورانی کنارے رنگ دیتی ہیں۔ اور ہر رات کے بعد مشرق کے سینے سے نورانی شعاعیں پھر کائنات کو جگمگا دیتی ہیں مگر تو اُبھرنا نہیں سیکھا! اصل میں تو اپنے غروب کو طلوع کا دروازہ نہیں سمجھتا حالانکہ ہر نئی ساعت تیری زنجیر کھٹکھٹاتی ہے اور تیری آنکھیں کبھی باسی مناظر کا ناشتہ نہیں کرتیں۔

تو اس دور میں دعاؤں کی پان لگا کر اُمیدوں کی سنگی بنتا ہے۔

اور یہ نہیں سمجھتا کہ تیری اس بُزدلی پر عورتوں کی صلاحیت ہونٹ پچکتی ہے۔ کیونکہ زندگی نقد سودا کرتی ہے اور موت اُدھار کا وعدہ

تو اس سے آگاہ کہاں کہ کائنات کا ذرہ ذرہ تجھے اپنے دل و جگر سے آشنا اور خاصیت سے آگاہ کر دینا چاہتا ہے، تو اپنے ارتقائی ٹکڑے کی سرگاہوں سے مطلق آگاہ نہیں تیرا تو ایک سرا عرش اعظم کی چوٹی میں گندھا ہوا ہے اور دوسرا گندی نالی میں لٹک گیا۔ تو خود کو درمیانی گتھی کی سانٹھ نہیں سمجھتا۔

کسی حیوان کا احاطۂ عمل اتنا وسیع نہیں کہ انسان کی قمیص پہن سکے اور کوئی انسانی گناہ شاید ایسا نہیں کہ مویشی خانے میں بندھوا دے۔ انار کی ٹہنی سے ببول نہیں اُگتا اور گائے کی غیرت کبھی گدھے نہیں جنتی !!!

اپنے ماضی کی حیوانیت کے کنوئیں میں جھانکنا برا نہیں مگر حیوان میں یہ شعور کیسے ممکن ہے کہ انسانیت کے منڈیر تک پہنچ جائے

شیطان ہمیشہ خدا کے راستہ پر ملتا ہے اور تقدس کے ویرانے پر اس کے دوسرے نائبین کس قدر قابلِ مغفرت ہیں اس راہ کے مدفون !

تیری بلندی میں بھی تیری ہی کوئی خود غرض آسودگی ٹھہری ہوتی ہے ورنہ تیری پستی اس قابل نہیں کہ کسی عروج کی پیاس بجھا سکے۔ شاید تو فطرت کے لیئے دائیں ہاتھ کی چھٹی انگلی ہے۔

تیری نگاہ نے ابھی اپنا احاطہ نہیں چھوڑا اور تیری طلب نے ابھی ترک کے بیٹھے پن سے آگاہ نہیں اس لئے تیری زندگی تشنج ہی تشنج ہے۔

شاید تو یہ بھی بھولا بیٹھا ہے کہ تو خالص نہیں رہا تجھ میں سیسہ زیادہ ہو گیا ہے اور پارہ کم، اسی لئے تیرے پاؤں کے نیچے ذرّے چرچراتے ہیں اور تیرے پنڈول میں سنگریزے مل گئے ہیں اور ہوا بگولوں کے اسکول میں داخل ہو گئی۔

شرم کر کہ تیری آگ خس و خاشاک سے دہکتی ہے اور تیرے جسم میں گندے پانی کے سوا کچھ نہیں کیا تو اپنے سرمایۂ حیات میں کیچڑ کے سوا اور بھی کچھ خیال کرتا ہے؟

آسمان تجھے زمین کے جبڑے سے نہیں نکال سکتا اور نہ تو اس قدر لطیف ہے کہ پرواز کر سکے۔ تیرے پروں میں تو لاسا لگا ہوا ہے۔ کیونکہ تو اپنی تہ سے بھٹک گیا ——

انسانی ضمیر کی ندی ہمیشہ دو رُخی بہتی ہے بلندیوں پر جانے کے لئے ستاروں کے سنگ میل جگمگاتے ہیں اور پستی میں اُترنے کے لئے پاتال ہی پر سلسلہ ختم نہیں ہو جاتا۔ لیکن اس پستی اور بلندی کی حدِ فاصل پر کچھ انسانی وجود بھی بانٹے جاتے ہیں جن کی نظر میں دونوں مقام ہیچ

. اماقی شاہ تیری ولادت کو یوں بیان کرتا ہے کہ عناصر نے وضع حمل کیا اور میلادِ انسان کا غلغلہ بلند ہوا اور نہ جانے کب تک یہ فطرت کے گہوارے میں رہا۔ خدا جانے کب تک تاریکی کے لحاف سے گھبرائی ہوئی صبحیں اور نیند کے کالے ریت سے بوجھل شامیں اس پر سائے ڈال کر گذرتی رہیں۔

پھر اس کی پرورش کے لئے دائیوں کی مصلح جماعت بھی مصروف پرورش رہی۔ آخر جب اس کے مسوڑھے سخت اور زبان کھُردری ہو گئی، تو ایک کامل اتالیق آیا اور زندگی کے مکمل آئین و قواعد سے تربیت کرتا رہا۔ اُن آئین و قواعد سے جن میں ہر زمانے کے ساتھ موزونیت کی صلاحیت موجود ہے۔

اس مکمل مصلح اور کامل اتالیق کے بعد انسان آبادیوں میں پھیل گیا۔ کہیں کچے گھروندے بنا کر ڈھائے کہیں اقوام کی مختلف محلہ بندی پر لڑائی جھگڑے ہوئے اور شعورِ ارتقاء کے ساتھ اپنی استعداد کے مطابق حق کی تائید اور باطل کی تکذیب کرتا رہا اور کر رہا ہے۔

اب رہا حق و باطل کی تمیز کا معیار، وہ وقتی ودیعت کے ہنگامی تقاضوں سے بدلتا چلا آ رہا ہے اگرچہ یہ ماحول اب تک صداقت کے اکھڑپن اور ریا کی ترمی کو پرکھنے سے عاری ہے کیونکہ یہ روحانی بلوغ کی باتیں

ہیں تاہم اس کی مسلسل جد و جہد بتا رہی ہے کہ یہ چودھویں صدی سے گذر کر اپنی وراثت کا صحیح حقدار ہو سکے گا۔ کاش یہ جد و جہد اُن قوانین پر ہوتی جو نظام فطرت کے عنوانات ہیں۔

اگرچہ اس میں کہیں کہیں کم ہمتی کو دھکا لگتا لیکن صداقت اور حق تو ہمیشہ مصائب کے نیلام گھروں اور مشکلات کے گوداموں سے دستیاب ہوتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ مادّہ اور روح دونوں کے راستے ایک ہی شہر حیات میں جاتے ہیں۔ لیکن گھر سے چلنے والے خطرے سے محفوظ نہیں ہوتے اگرچہ وہ شاہراہوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔

اس کے سن بلوغ کے قریب اس کے مخفی جوہر اور بھی آئیں گے۔ اور باطل کے سائے حق کی روشنی کی خوراک ہو جائیں گے کیونکہ روشنی ذی رُوح ہے اور تاریکی بے جان، اور حرکت کبھی سکون کے آغوش سے باہر نہیں دھڑکتی۔

زندگی خواہ کچھ بھی نام پا جائے اور ارتقاء اسے چاہے کسی بھی اونچے منارے پر لے چڑھے لیکن یہ ہمیشہ کسی اپنے سے بلند طاقت کو محسوس کرتی رہے گی۔ کیونکہ کوئی رقص ہو یا لغزش بے پشتی نہیں ہوتی۔

زمین گول ہی سہی یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں کیونکہ رفتار کا تعلق دائرے

سے ہے۔ اور زمین ہی کیا ہر ستارے کی گردش اُسے گول بنائے ہوئے ہے لیکن ایک موسم ایک دور اور ایک عالم کا دوبارہ آنا بتاتا ہے کہ اس کے علاوہ کوئی اور طاقت بھی ہے جو تمام نظام شمسی کو لئے ہوئے ایسی گردش میں ہے جو ایسی کا راستہ نہیں جاتی اور جس کے دائرے کے سرے کبھی نہیں ملیں گے اور اسی طرح شاید اور گردشیں بھی حفاظت کر رہی ہوں۔

ایک وقت جو اس کائنات پر گذر جاتا ہے اس کا استر کبھی کسی دوسرے ابرے میں نہیں ٹنکتا۔ بعض عالم میں ایسے مکانات بھی ہوتے ہیں جن کا خرق عادت سے کوئی ناتا نہیں ہوتا۔ دنیا کے بڑے بڑے تغیر اور فضائی انقلاب اسی سے تعلق رکھتے ہیں۔

پیغمبروں کا وجود اور تاریخی انقلابات کے علاوہ عالمگیر امن و استیلا اور سحر و اعجاز اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں جن کی جھنکار گردش کی بھبھکی اور نرم خاموشی میں دھنس کے رہ جاتی ہے اور کوئی طاقت اسے واپس نہیں لاسکتی۔

جو زندگی اور موت کو ایک گردش کی پابند خیال کرتے ہیں وہ روح فطرت کے لامتناہی ہونے پر معترض ہیں اور غالباً اُن کے ساتھ وہ بھی جو ازل کے مقابل میں ابد کی ایسی بنیاد قائم کرتے ہیں جس میں تغیر کا امکان نہیں اور تنوع سے عاری ہے۔

# زندگی

شکر کے سجدے کرو کہ زندگی مقصد نہیں بلکہ راستہ میں قیام کی ایک کیفیت ہے۔

کیا یہ مسرت کم ہے کہ زندگی شب و روز گزر رہی ہے۔ محسوس کرتے ہو مگر شعور نہیں کہ کیا مسرور ہوتا ہے۔ انسان جد و جہد میں مقصدی جنگ اور شہادت کے آثار ہیں حسن و عشق کی پُرخوف وادیوں میں بخوش انجام مشکلات اور مہمات ہیں کیونکہ ہر بلند مقصد کے پیچھے عبور کے فوارے اچھل رہے ہیں اور ہر ہلاکت آفریں پیام کی پیشانی میں بے ثباتی کے جلوے اشارے کرتے ہیں۔

جو لوگ اس کڑوی اور کسیلی دوا کی حقیقت سے آشنا ہو گئے

ان کے تبسم کشتیاں ہیں ساحلِ عافیت کی۔

دنیا میں وہی شخص مسکرا کر اطمینان کا سانس لے سکتا ہے جو اس زندگی سے بلند ہو جانا چاہتا ہو اور اس طرح کہ ایک پاؤں اس کا ساحل کی گیلی ریت پر ہو اور دوسرا کشتی کے لرزتے ہوئے کنارے پر—!

مختلف ذرائع سے فرصت کو بانٹنے کا نام کیفِ زندگی ہے، اور بانٹنے کے تمام طریقوں میں خدمتِ خلق سب سے افضل طریق ہے کیونکہ اس میں زندگی زخمی اور دردمند رہتی ہے۔ یہ عبادت بھی ہے اور لذّت بھی۔

اپنے لئے نہ مر! دوسروں کے لئے جی تاکہ زیادہ نہ جی سکے ابھی سے ارادوں کے چشمے ہاتھ پاؤں میں پھیلا دے تاکہ بار آور ہو کر جلد گر پڑے۔ گرمی سردی سے ٹھٹھرنا یا بجھنا نصیب نہ ہو۔ زندہ وہی ہے جو زندگی کو تقسیم کر رہا ہے یا چو لیتا ہے پھینک دیتا ہے یا پھر کسی معبد کے دروازے کی چوکیداری کے لئے وقف کر ڈالتا ہے۔

زندگی اپنی چیز نہیں یہ تو امانت ہے دوسروں کی اس میں تو حصہ ہے کائنات کے ہر متنفس کا۔ تیرے ذاتی اسٹیشن پر سرخ جھنڈیوں اور لال بتیوں کے سوا کیا دھرا ہے۔ یہیں سے تو دوزخ کے تمام

چھوٹے بڑے اسٹیشنوں کے لئے کانٹے بدلتے ہیں۔

کیا تو بہرا ہے کہ اپنی زندگی کے منار پر صبح و شام خطرے کا الارم نہیں سُنتا۔

جو زندگی ترقی کے موڑ پر مڑتے ہی پہلے زینے پر آبدیدہ نہیں ہوتی وہ احسان فراموش اور ناشکر گزار ہے۔

زندگی میں ہر ٹھوکر راستہ کا چراغ اور راہرو کی وراثت ہوتی ہے۔ اگر تو اپنی گمراہی کو چراغ نہیں سمجھتا تو بددیانت ہے۔

بیدار زندگی وہ ہے جو آنے والے کو بسم اللہ اور جانے والے کو الحمدللہ کہتی ہے جس کی فطرت میں استقبال بھی ہے اور تشکر بھی۔

جو زندگی غیور اور ہر کیلی نہیں اور غیرت کی طرف نہیں بڑھتی۔ وہ انسانی زندگی نہیں بلکہ اس کے ہسائے میں سور یا ریچھ کا خمیر شامل ہے۔

زندگی کے میلے میں دماغ دل کی انگلی نہیں چھوڑا کرتا اور اگر ایسا ہے تو زندگی راستہ بھٹک گئی!

زندگی میں کارڈوں کا رواج نہیں بلکہ وائرلس کا کیونکہ تو بذاتِ خود مقیم نہیں مسافر ہے۔

اگر تو خود غرضی اور انسان دشمنی سے دامن چھڑا کر زندگی کے زینے پر چڑھے تو تیری منفرد مفلسی ہر موڑ کے اندھیرے میں تیرا ہاتھ پکڑے گی۔

تیری زندگی تو طوائف ہے جو گناہ کے وقت ہی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ اور تو اس سے دائمی رشتہ پر مصر ہے! اس سے نکاح نہ کر ورنہ سب جاذبیتیں ختم ہو جائیں گی۔

کیا تو آگاہ ہے کہ تیرا شیر تیرا نفس ہے جو زندگی کے جنگلوں میں صورتوں کا شکار کیا کرتا ہے۔ اور اُسے ہی زندگی کا لقب دیتا ہے۔

زندگی ایک بھٹکی ہوئی طاقت ہے جو اپنے مرکز سے علاحدہ ہو گئی اور جیسے ستاروں، آبشاروں، چراغوں، پھولوں اور خدوخال کے ہجوم میں یہ بھی یاد نہیں کہ مجھے کہاں پہنچنا ہے اور یہ بھلا بو کھلا کر ناقص تسکین گاہوں اور عارضی سکون زاروں کو اپنی منزل خیال کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ کہیں یہ محبت کی شراب کی عادی ہو گئی۔ کہیں دولت کی افیون کی اور کہیں عبادت کی کیمیا سازی کی،

زندگی کے صحن میں شعلوں کے پھول، داغوں کے چراغ اور آنسوؤں کے ستارے روشنی کرتے ہیں۔ اس کی صبحوں میں ٹھنڈی سانسیں اور شاموں میں چیخیں اُگتی ہیں۔ کوتاہ عقل لوگ اس کی دوسری منزل میں نہیں جاتے، دیکھنے میں اگرچہ وہ تاریک نظر آتی ہے، اور کبھی کبھی بجلی کی جھلک میں اس کی چھت پر ہڈیوں کے انبار اور خنجروں کے ٹکڑے دکھائی دیتے ہیں لیکن یہیں آفتابوں اور ماہتابیوں کے کارخانے

بھی ہیں اور سیرتوں کی ڈھلائی کی فیکٹریاں بھی یہاں دلوں کے جلسے ہوتے ہیں اور روحیں تقریریں کرتی ہیں۔

زندگی کی تعمیر زندگی کے نقلی کھوکھلے اور پُرشور مکانات کو ڈھا کر ہوتی ہے اور ماضی سے زیادہ شاندار و پائدار!

عزمِ حیات دب کر مرضِ حیات بن جاتا ہے مگر ستم تو یہ ہے کہ لوگوں نے عزمِ حیات اصل میں حصولِ اقتدار کا نام رکھ لیا ہے۔ جو ناموزوں بھی ہے اور غلط بھی۔ یہ تو بدی ہے جو نیکی کے جوتے چُرا کر پہنے ہوئے ہے۔ اس کی سبک رفتاری میں سلامت روی نہیں۔

صحیح زندگی تو وہ ہے جو ہر لمحہ ایک نئے عبور سے تعارف کرتی ہوئی بڑھتی چلی جائے، راستے خواہ پیچیدہ ہوں یا ناہموار، پُرخار ہوں یا پھسلنے والے ڈھلوان!

زندگی تو قربانی کی خوگر ہوتی ہے اور مقصد بھی غالباً یہی ہے حکومتوں کی چودھری، عظمتوں کا شب خون اور بلندیوں کی لوٹ اس کا مقصد نہیں یہ چیزیں تو زندگی کے دسترخوان کی ہڈیاں ہیں جنہیں آوارہ کتے ہی چوستے اور چھوڑتے رہتے ہیں اور آپس میں غرّانا ہی ان کا کام ہے۔

صحیح زندگی تو ہر آغاز سے پہلے انجام کو دیکھ کر چلتی ہے وہ دنیا

کی انگشت نمائی کی پروا نہیں کرتی کیونکہ نیکی اور بدی کے اجزاء اشتراک کو وہ غیر شعوری طور پر جانتی ہے۔ اس پہ ہر راہ روشن اور ہر راز بے نقاب ہو جاتا ہے۔

زندگی کو اپنی ہی تعمیر میں صرف نہ کر تُو تو حصہ دار ہے مالک نہیں یہ تو عوام کی ملکیت ہے اور ہر شخص حق شفعہ کے دعوے کا مجاز!

زندگی میں حقائق کے دریچے اس وقت کھلتے ہیں جب فکر سِن بلوغ میں قدم رکھتا ہے اور انسان خود کو محتاجوں میں تقسیم کر دینا چاہتا ہے، اس کی نظر کو قرار نہیں ہوتا وہ ہر قدم پہ اپنے اُن ساتھیوں کی طرف دیکھتا ہے جو محدود مقاصد کی ریت میں آہستہ آہستہ دھنستے ہوئے چل رہے ہیں۔

زندگی کا گھر اپنی تڑپنے سے قیمت پاتا ہے اور سیرابی سے عمر کے پاؤں سُن ہو جاتے ہیں۔

زندگی کا مقصد تلاش کے سوا کچھ نہیں، مختلف راستے پر پھر کر اپنی ہی طرف لوٹ جاتے ہیں۔

زندگی اپنے کپڑے کسی ایسے گھاٹ پر بھول آئی جسے طوفانوں کے اتار چڑھاؤ نے اوجھل اور نامعلوم کر دیا ہے یہی باعث ہے کہ کچھ وقت تلاش میں گزرتا ہے کچھ الجھن میں اور کچھ انتظار میں لیکن

زندگی موت کا ساحل آنے تک دریا نہیں چھوڑتی۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ جس کو پھانسی دی جا رہی ہے وہ پھانسی سے زیادہ تکلیف رساں زندگی سے نجات پا رہا ہو۔

حقائق حیات، باطل سے دب تو جاتے ہیں لیکن دفن نہیں ہوتے۔ دھوپ کی چھوٹ اور برسات کے دو ڈونگڑے ٹوٹے ہوئے آبگینوں کو اُجال دیتے ہیں اور ٹھیکریوں پر زنگ آجاتا ہے۔!

زندگی کے مسافر کو سرائے کی بھٹیاری یا دوسری طرف جانے والے مسافروں سے رشتے مستحکم کرنے کی ضرورت نہیں! مسافر کے لئے تو سفر ہی بہتر ہے نہ کہ قیام۔ کیونکہ ہر سرائے میں صلاحیت کے رجسٹر پائے جاتے ہیں۔!

جو اپنے فن کو تسلیم کرانا چاہتے ہیں اُن کے لئے سامعین اور حاضرین کے فنون کا دیباچہ اور بعض اوقات اپنے فن کے نشیبوں کا اعتراف لازم آتا ہے کیونکہ یہی تو اصل میں حاشیہ ہوتا ہے اپنے کمال کا۔

# جہاد

شہید ایثار سے موت کو حسین بنا لیتا ہے اور غازی اس ایثار کے لئے زندہ رہتا ہے!

کام چوروں، بزدلوں اور بیماروں کی طرح عوام کے بستر پہ مرنا بہادروں کی شریعت میں نہیں۔

جو زندگی کو یک مشت ادا نہیں کرتا وہ ذلت سے بالاقساط جان دیتا ہے۔ بزدل کی زندگی میں چہرے نہیں دیئے جاتے کیونکہ دنیا کو گندے مواد کی ضرورت نہیں۔

گمنامیوں کے گند میں ڈوبے ہوئے لوگ کیا جانیں کہ زندگی میدانِ جہاد ہی میں اپنے معنی سمجھتی ہے جب وقت کی رفتار اور موقع کے تقاضے کے ساتھ جب آئیں کنوتیاں بدلتی ہیں اور شجاعت کے اَیال کھڑے ہو جاتے ہیں۔

میدانِ جہاد ہی ایک ایسی جگہ ہے جہاں مردانگی اور دلیری کے سر پر دینِ فطرت چھتری لگا کر چلتا ہے اور دائیں بائیں جنّت و جہنم دونوں طرف سے بلاوے آتے ہیں۔ صحیح زندگی اس وقت ایثار کے سوا ہر کلیئے کو ڈھکوسلا خیال کرتی ہے۔

عوام کہاں واقف ہیں کہ جہاد میں مردوں کا خون بولتا ہے اور زبانیں خاموش رہتی ہیں۔

غازی کی زندگی اندیشے سے بلند اور شہیدوں کے احاطے موت کی قلمرو سے باہر ہیں۔

شہیدوں کی خوابگاہوں میں قدرت کے محاسب نہیں آتے اور غازیوں کے سامنے زمین اپنے خزانے اُگل دیتی ہے۔

جو اپنے لئے جیتا ہے خسیس ہے جو دوسروں کے لئے مرتا ہے شہید ہے جس کی کیفیتوں کا جلسہ کبھی برخاست نہیں ہوتا۔

جو جہاد میں مرنے کے لئے نہیں بڑھتا اس کے ایمان کی سرِ دست تک خالی رہتی ہے۔

اس کی خامیاں پختہ ہو کر فطری خوبیوں کو بے پالش چھوڑ دیتی ہیں۔ جس سے اس کی زندگی خارش میں مبتلا ہو جاتی ہے اور گندھک کا چشمہ نصیب نہیں ہوتا۔

میدانِ جہاد اور موت کی پیشی سے بدک کے ہٹنے تھوڑ دلے اپنی قبروں کی چہار دیواری کی لیپ پوت میں مصروف رہتے ہیں جنہیں اُن کے بعد وقت کی عظمت کا پہلا سیلاب منہدم کر دیتا ہے۔

مذہب کے نمک حرام کیا جانیں کہ جہاد ہی میں زندگی اپنی قیمت کا اعلان کرتی ہے اور آتش بہ آسمانی گاہک ٹوٹتے ہیں۔

جو فیصلہ و تقسیم کے دشمن ہیں اور فطری احکامات کے مطابق انصاف کے پیمانے سے کام نہیں لیتے ان کے لئے طاقت و تدبیر کی طرف سے سزا مقرر ہوتی ہے جو ان کے اندازے کی چہار دیواری سے اونچی اور قیاس کی رسائی سے باہر کی شے ہے۔

تقاضے کے وقت جہاد کو حرام قرار دینے والا عالم دُنیا دار ہوتا ہے۔ وہ اپنے وقار کی چوکی پر سوتے چاندی کے پترے جڑنا چاہتا ہے وہ دشمنی کے معاملہ میں تو اچھا مشیر اور تخریب میں اعلیٰ مجوز ہو سکتا ہے مگر دین کے معاملہ میں ہرگز اعتبار کے قابل نہیں کیونکہ پاکیزہ گیاں گندے چاہ بچوں میں قیام نہیں کرتیں۔

سانپوں کو کینچلیاں اُتارنے کے لئے تنگ زاویوں اور خراشوں کے خطرات سے گذرنا پڑتا ہے، بزدل نہیں سمجھتے کہ انسان کی کینچلی صرف میدانِ جہاد ہی میں اُترتی ہے۔ کینچلی ڈالنے کے اور بھی بہت

یے رستے بنائے جاتے ہیں مگر شاید وہاں آنکھوں سے پردہ نہیں ہٹتا اور جسم کی تخلیص کے بعد بھی اندھاپن باقی رہتا ہے۔

جہاد میں ہر صف ہیں دھاڑنے والی موت مرنے والوں کو شہادت کے تمغے عطا کرتی ہے اور زندہ رہنے والوں کو معلومات کی دنیا، جس میں عزت، احترام، دولت اور تاریخ کے ذخائر ہوتے ہیں۔

جہاد سے گھگھیانے والے بودے اور بودے اجسام ایک بے قیمت اور بدنام عرصہ تک آرزوؤں اور امیدوں کی سواری میں رہتے ہیں لیکن جب جوانی کی اُفق پر اضمحلال کا سورج نکلتا ہے تو بہت جلد پسینے کے مارے ان کے تنہرو گل جاتے ہیں اور امیدیں ہر قدم پر زمین کستے کستے بیدم ہو جاتی ہیں کیونکہ ان میں پتّا مارنے کی عادت نہیں ہوتی۔

تمہاری جماعت سے شاید اب یہ نظریہ اُٹھ چکا ہے کہ دن جہاد کے لئے ہے اور رات آرام کے لئے اور جو رات کو بھی آرام سے دست بردار رہتے ہیں ان کے لئے قبر کا آرام لازمی اور اٹل ہو جاتا ہے۔

جہاد اُسی کے حکم یا آواز پر ہو سکتا ہے جس کے لئے دل میں محبت ہو اور صحیح محبت وہ ہے جو عزت، عظمت اور سچائی سے مرتب ہوتی ہو اور ان چیزوں کا خمیر بنتا ہے بڑائے نتیجوں اور نئی معلومات سے انکھوں کو

بزدلوں کی تاریخ کے بہشت میں حاضری نہیں بھری جاتی وہ رجسٹر تو مجاہدوں، جانبازوں اور وحدت پرستوں کا ہے۔

عوام کا طبقہ گمنام مگر اتفاقی حاکم سے محبت نہیں کرتا بلکہ مجاہد جمہوری، زیرک اور منصف سے!

مجاہدوں کے دن عقابوں اور راتیں شیروں کی طرح گزرتی ہیں اور یہی زندگی کا اصل مقصد ہے!

یاد رہے کہ بزدل کے ہاتھ سے مرنا موت کی توہین ہے، اور بہادر کے خنجر سے قتل ہونا زندگی کی عظمت!۔

ایمان دار وہی ماں باپ ہیں جو اپنی اولاد کو حسینؑ کی جانشینی میں دے کر میدان جنگ کو پرورش گاہ سمجھتے ہیں اور شہادت کو سن کر سجدۂ شکر ادا کرتے ہیں۔

غیرت اور خودداری میں جان دے دینا بے غیرتی اور خود فروشی میں زندہ رہنے سے بہتر ہے صحیح روحیں اور حقیقی جسم باطل کے سامنے نہیں جھکتے جو جسم باطل کے آگے لچکتا ہے وہ جھپٹتی ہے اور جو روح باطل کو تسلیم کرتی ہے وہ دھواں ہے ضمیر کی چتا کا۔

مجھے تو یہ کہنے میں بھی باک نہیں کہ خدا کی مشیت اور پیغمبروں کی دعائیں مجاہدوں کے خون ہی سے صورت پذیر ہوتی ہیں۔

# اَدَبی وراثت

جہاں پیشرو جماعتیں آئندہ آنے والی جماعتوں کے لیے اپنا ادب وراثت میں چھوڑتی ہیں وہیں اپنے تجربات اور نتیجے بھی دیتی ہیں جن میں سے ماحول اور فضا کے مطابق مواد تو رکھ لیا جاتا ہے اور باقی تاریخ کے محافظ خانے کی زینت ہو جاتا ہے۔

اس ورثہ کے استعمال میں فرق صرف اتنا رہ جاتا ہے کہ کچھ لوگ تو اس مواد کو سموچا ہی ہضم کر لیتے ہیں اور جگال جگال کر جُزوِ بدن بناتے اور کچھ ایسے ہیں جو چبا کر کھاتے ہیں۔ جگالی کر کے جُزوِ بدن نہیں بناتے۔ ان میں قوّتِ ہاضمہ زیادہ پائی جاتی ہے۔ ان کے علاوہ ایک جماعت ایسی بھی ہے جو اسے اپنا کر

استعمال کرتی ہے اور اسی کے ساتھ ایک گروہ ایسا بھی ہے جو صرف تاثر لیتا ہے اور مادہ کو نظر انداز کر دیتا ہے اس سے یہ ہوتا ہے کہ وہ تاثیر ان کے نظریات میں گھل مل کر بعض اوقات مفید ترین مواد پیدا کرتی ہے۔

جو جگال کر ہضم کرتے ہیں وہ انفرادیت تک رہتے ہیں اور دنیا کے لئے کچھ نہیں چھوڑتے اور چھوڑتے ہیں تو صرف اپنا نام باقی رکھنے کے لئے چند یادگاریں جو زمانے کے سیلاب کے ہمراہ منہدم ہو جاتی ہیں۔ اس جماعت میں بلند پایہ تاجر اور وکیل ہیں!

جو چبا کر کھاتے ہیں اور جگالی کر کے جزوِ بدن نہیں بناتے ہیں معلم اور پروفیسر وغیرہ شامل ہیں ان کی زندگی پیشے کے اعتبار سے نیکی ہے۔

اس مواد کو اپنا کر استعمال کرنے والے لوگ وہ افسانہ نگار ڈرامہ نویس اور ناولوں کے مصنفین ہیں۔ ان کی سزا و جزا انکے رشحات قلم ہیں۔

جو تاثیر کا استعمال جانتے ہیں وہ ایماندار مؤرخ کہلاتے ہیں یا انقلابی شاعر۔

لیکن یہ استعمال غیر شعوری ہوتا ہے۔ اس میں ان کے ارادے کا دخل نہیں ہوتا۔ انہیں میں ایک اور طبقہ بھی ہے جو جزئیات کا مطالعہ کرتا اور اس کے مرکزی نقطہ کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔

وہ فلاسفر نقاش اور سیاسی لوگ ہیں ان تمام شخصیتوں میں کوئی بھی غیر ضروری نہیں۔ لیکن جن کے خیالات اور تصورات سے قوموں کے مستقبل طلوع ہوتے ہیں وہ افضل و برتر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے بھی پائے جاتے ہیں جو اہمیت تو نہیں رکھتے لیکن بھیس بدل کر قریب کارانہ رویہ سے اس حلقے میں داخل ہو جاتے ہیں اور اپنی اس خامی کو چھپانے کے لئے جماعت بندی، پارٹی بازی، اور آئے دن نئے اداروں کی تشکیل ان کا مشغلہ ہوتا ہے۔

اگرچہ یہ ادبی بہروپیے عموماً تعلیم کے لبادے اور تہذیب کے چغے پہن پہن کر اپنا تعارف کراتے ہیں لیکن ان کے قابلِ فخر ہتھیار روزانہ اخبار اور ماہانہ جرائد کے صناعانہ ایڈیشن ہیں جو ان کی گندی فطرتوں کی نقاب کشائی اور اس کے شجرہائے نسب کا افتتاح کرتے ہیں جس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ یہ اپنے حلقے میں ایک محدود وقت تک "من ترا قاضی بگویم" پر دن پورے کر کے مر جاتے ہیں اور تاریخ کے صفحات پر ان کی گنجائش نہیں نکلتی۔

اگرچہ ان میں سے کچھ ذہین قسم کے عیار ایسے بھی ہیں جو اپنے دور کی تاریخ کے حصے مرتب کرتے اور کراتے ہیں اور انہیں یک گونہ مسرت ہوتی ہے، لیکن اُن کی نظر اس پر مطلق نہیں ہوتی کہ مستقبل کا نقاد اس

مواد کو بھی عمل تحلیل سے محروم نہیں رکھے گا۔ اس کے قلم کی ایک جنبش اور نیف یاتی استفسار کا ایک سوال مہد سے لے کر لحد تک کی نامنصفی اور گندم نما جو فروشی کو جواب میں طلب کرے گا اور یہ زرق برق کتابیں اور الفاظ کے حسین دائروں میں مکروہ مطالب کی سنہری تحریریں لپیٹو از تار پھینکیں گی۔

اگرچہ شعور علم کا لابدی نتیجہ ہے لیکن یہ لوگ مکتبی حدود اور روایتی دلدلوں کے باعث نتیجے تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتے اور علم کو ایک انفرادی نفس پرستی کا ذریعہ سمجھ کر خندقوں سے چٹانوں کی طرف قدم نہیں بڑھاتے۔ اگر کبھی کوئی چٹان اپنے بوجھ سے گر پڑتی ہے تو یہ اسے اپنی تدابیر کا کرشمہ اور تجاویز کا حاصل سمجھ بیٹھتے ہیں۔ انہیں لوگوں کے گندے سانسوں سے آئے دن ادبی سیاسی اور مذہبی فضائیں مسموم رہتی ہیں اور عوام تشویش و تردد کے دائروں میں بھٹکتے رہتے ہیں۔

ان غیر مخلص لوگوں کا علم و ادب ہرگز اس قابل نہیں ہوتا، کہ وہ دلوں کے برف میں چنگاریاں اور روحوں کے اندھیروں میں روشنی پیدا کر دے۔ وہ بزدلی کو شجاعت اور کھوکھلت کو پختگی میں نہیں بدل سکتے۔

یہ عموماً صحیح انسانوں کے راستے روکنے اعدا ان کی بلندیوں کو نشیبوں

میں تبدیل کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ کیونکہ ان کے کارندوں کی رہت
میں سمینٹ نہیں ہوتا بلکہ پانی ہی پانی۔ اگر غائر نظر سے دیکھا جائے تو
زندگی کے ہر شعبے کا نقص اسی تعلیمی ادارے کا نقص ہے جہاں جذبات
اور خیالات کا کچا مسالہ مشکل اور سخت ہوتا ہے اور تعلیمی اداروں کے
اصول و قواعد اُن کے سرپرستوں کی سیرتوں اور پالیسیوں کے تحت وضع
ہوتے ہیں اِن میں ہر جہت سے واضعین کی ذاتی بلندی اور انفرادی
مفاد مضمر رہتا ہے۔ اور یہ پرورش گاہیں جدا جدا رنگ میں ہونے کے
باوجود تخریب کے ایک ہی راستے پر بڑھ رہی ہیں اور کیوں نہ بڑھیں
جبکہ ہر اسکول اور ہر ادارے کی پشت پر کسی نہ کسی فرقے یا غیر اسلامی نظام
کی مُہر لگی ہوتی ہے اور اس مُہر سے تعلیم کے جملہ حقوق ادارہ کے موجد
یا واضع کے نام محفوظ ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ہر فرقہ تبلیغی طور پر اپنی استعداد اور قوت
کے مطابق پھل پھول رہا ہے اور آئے دن نئے نئے فرقوں کی
بنیادیں ابھرتی جاتی ہیں جو پلستر والے اداروں کی شاخیں ہیں۔

ملک کے ملک میں کہیں اور کسی شعبے میں بھی غیر اسلامی خیالات
پر دائرے اور تصورات پر کنارے نہیں ہیں جو جس طرف چاہتا ہے
بہ نکلتا ہے یہی وجہ ہے کہ ملک سیاسی طور پر بھنگم مالی طور پر مفلس اور زکری

طور پر مفلوک الحال نظر آتا ہے اور زندگی کے ہر گوشے میں غیر ملکی روشنی مصنوعی اُجالا کئے ہوئے ہے۔ دوسرے ملکوں سے علمی اکتسابات کوئی کفر نہیں لیکن اپنے ملک اپنی زبان اور اپنے مذہب سے بے وفائی بنیادی نقص کی علامت ضرور ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ہر ملک کے لوگ غیر ملکی زبانیں لکھتے پڑھتے اور حاصل کرتے ہیں لیکن ان کے پیش نظر ایک ہی مسئلہ ہوتا ہے کہ دوسرے ممالک کی تعلیم، تہذیب، فلسفہ، جغرافیہ اور معاشیات سے آگاہ ہو کر انہیں طریقوں پر اپنے ملک کو سرسبز و شاداب بنائیں لیکن بدقسمتی سے ہمارے ملک میں یہ نظریہ نہیں، یہاں تو غیر ملکی زبانیں اس لئے تحصیلتے ہیں کہ اپنے ملک میں ان کی خرابیوں کے انکشش کر دیئے جائیں اور اپنے ملک کے محاسن مطعون ہوں۔

انتہا یہ ہے کہ وہ لوگ جو غیر ملکوں میں تعلیم و تربیت کی غرض سے جاتے ہیں، اوّل تو وہ مذہب سے ہی منحرف ہو جاتے ہیں اور جو مذہب نہیں بدلتے وہ عمر بھر اپنے ملک کے لئے اجنبی اور یہاں کے باشندوں کے لئے نامانوس سے ہو جاتے ہیں۔ وہ یہاں کی معاشرت پر ہونٹ چبکتے اور یہاں کے رسم و رواج پر ناک بھوں چڑھانے لگتے ہیں۔

اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ مغربی علوم نے ہماری آنکھیں

کھول دیں اور ہمیں ذہنی اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لے آئے۔ لیکن یہ بھی غلط نہیں کہ اس سے ہمارے ملک کے مذہب اور یک جہتی کو بہت بڑا نقصان پہنچا ہے۔ کیونکہ حکومت اور اس کے شاگردوں نے زندگی کے ہر موڑ پر تقسیم حکومت کے نظریہ کا مظاہرہ کیا جس سے عقیدے کمزور، اتفاق بودا اور ادبی رشتے کچے پڑ گئے دوستوں میں فاصلے اور اعزا و اقربا میں دیواریں حائل ہو گئیں۔ ہر شخص اپنے مقام پر خود کو تنہا اور بے سہارا محسوس کرنے لگا اور اسی تقسیم سے حکومت اور اس کی پالیسی بارآور ہوتی چلی گئی۔ نہ کوئی مدرسہ ایسا رہا جہاں اسلامی اور صحیح اسلامی تعلیم ہوتی، نہ کوئی ایسی خانقاہ کہ جہاں روحانی اسرار و رموز پر روشنی پڑتی اور انسانی معائب و محاسن اجاگر ہوتے جدھر نظر ڈالیے مادیت کا پرچار اور الحاد کی تبلیغ اسی طرح رفتہ رفتہ ہر شخص اپنے مذہب اور روایات کے علاوہ اپنے غیر مادی محاسن سے دور ہوتا چلا گیا تھا۔

بہت کم لوگ ایسے ہیں جنہیں اپنے مذہب کی ضروری معلومات ہیں اور دیکھنے میں آتا ہے کہ جب کسی مسئلہ پر گفتگو ہوتی ہے تو جہاں تک غیر زبان کی غیر ملکی معلومات کا تعلق ہے بے لکھے پڑھے انسان میں بھی اس کی استعداد کے مطابق مل جاتی ہیں لیکن جب ان کے ذاتی مذہب معاشرت اور اقتصاد پر نظر پہنچتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اس کے

کسی پہلو سے کوئی واسطہ نہیں ہے تو دوسرے ملکوں اور زبانوں کے رسیا ہیں جو بے کوشش و محنت اپنے گردوپیش کے ماحول کو ترقی یافتہ دیکھنا چاہتے ہیں اور ان کی زندگی جیب تراشی اور کھوٹے سکے بنانے کے سوا کوئی فن نہیں جانتی۔

تعلیمی نظام کی اصلاح لکھے پڑھے لوگوں کا کام ہے مگر میں دیکھتا ہوں کہ ان کی عقلوں کو زنگ لگ گیا اور ان کے علمی ملیقے کالے پڑ گئے ہیں، یہ عوام کو تعلیم کا حق نہیں دیتے اور امرا کو تعلیم فروخت کرتے ہیں میں دریافت کرنے کا حق رکھتا ہوں کہ ان کالجوں میں جہاں نوابوں، بڑے بڑے جاگیرداروں اور بلند منصبوں کے بچے تعلیم پاتے ہیں یا ان درسگاہوں میں جہاں منتخب بچے داخل کئے جاتے ہیں کیا وہاں کسی مزدور، معمولی کلرک، سپاہی، سیاہی مین، چپراسی معمار، چوکیدار یا جوتہ بنانے والے کا کوئی بچہ داخل ہوتا ہے اگر نہیں تو کیوں؟ کیا ان کاریگروں کے بچوں کے دماغ امرا کے بچوں سے ساخت میں کچھ خراب ہوتے ہیں یا امرا کے بچوں سے غربا کے بچے کم ذہین ہیں یا جسمانی حالت میں کمزور اور بوڈے واقع ہوتے ہیں۔ ہرگز نہیں سب نقص ہے، غیر اسلامی نظام کا جس میں تعلیمی گمراہی اور سیاسی افلاس جزو اعظم ہے۔

اس علمی اور سیاسی افلاس کے اثرات کو صرف اس وقت زائل ہو سکتے ہیں جبکہ تعلیم ایک نظریے اور ایک مرکزی خیال سے ہو اور درس گاہوں سے امراء و غرباء کا امتیاز اٹھا دیا جائے۔

تعلیم کے معاملے میں انسانی درجوں اور مراتب میں حد فاصل لگانا ان کی اولاد کی حق تلفی ہے جن کی محنتوں کے نتیجے میں حکومت کے چہرے پر تازہ خون دوڑتا ہے اور امراء فربہ اندامی سے بہرہ ور ہوتے ہیں لیکن نہ حکومت انہیں اس ایثار کا صلہ دیتی ہے اور نہ سرمایہ دار ان کا ممنون نظر آتا ہے بلکہ دونوں یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح ہو اس کی شہ رگ کے خون کا آخری قطرہ بھی سونت کر پی لیا جائے ان کی اس پر مطلق نظر نہیں کہ ہماری بقا و آرائش کا راز یہی ہے بلکہ وہ یہ سوچتے ہیں کہ اگر نیچے کا طبقہ ہماری ہمدوشی میں آگیا، تو ہماری اقتداری بلندی اور فرعونی وقار میں فرق آجائے گا۔ حالانکہ جو ملک مزدور کو زندگی اور اس کی آسائشوں میں برابر کا شریک خیال کرتے ہیں ان ملکوں میں ان کے اس حسن سلوک کے باوجود مزدور مزدور ہے اور کثیر تعداد میں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کام کے لحاظ سے مزدور مزدور ہے اور حق کے لحاظ سے سب برابر

اصل میں رعایا کی تعلیم کی ذمہ داری حکومت اور صرف حکومت پر ہونی چاہیئے کہ جو طریق درس اور مفہوم تعلیم مناسب سمجھے اسے رائج کرے اور اسی نظریے کے مطابق شعبہ ہائے تعلیم ہوں تاکہ ملک زیادہ سے زیادہ مضبوط اور عقائد مستحکم سے مستحکم ہوں۔ تعلیم کے معاملے میں مزدور اور سرمایہ دار کا امتیاز ایک ایسے انقلاب کے لئے زمین تیار کرتا ہے جس میں قتل و غارت اور خون خرابے کے سوا کچھ نہیں ہوتا آخر کب تک پست طبقہ امرا کی عشرت پسند اولاد کے لئے اپنے جگر کے ٹکڑوں کو غلامی میں دیتا رہیگا اور کب تک یہ گدھوں اور چیلوں کے مردار خور غول شاہبازوں کے انڈے پلیتے رہیں گے ؟

اب زمانہ پہلے سے بالکل مختلف ہے نادار طبقہ انقلاب کو دیکھ چکا اور اس کے اثرات کا اچھی طرح جائزہ لے چکا وہ سمجھ چکا ہے کہ مفاد پرستی کی فطرت میں نہ انصاف کا جذبہ ہے نہ ممنونیت کا اور غریبوں کے لئے خدمت میں اسی وقت گنجائش نکل سکتی ہے جب کہ مفاد پرستی نہ ہو۔ پہلے تو تدابیر و تجاویز اور امید و بیم کے اندھیارے چل رہے تھے جس سے دوست دشمن کی شناخت میں دیر ہوتی تھی اب تو خون کی بارش ہوئی ہے اور فضا کا زرد غبار بیٹھنے سے دور کے دھندلے اور بلند مینار صاف اور نزدیک نظر آنے لگے ہیں۔ اب تو معمولی اور بہت

معمولی انقلاب کا ایک ریلا ان کے پاؤں اکھاڑ دے گا اور ظلم کا کوئی رکن ان کی امداد کے قابل نہ رہے گا جو قانون فطرت کے خلاف انسانی لہو کو اپنی خوراک اور غریبوں کی عصمتوں کو روزمرّہ کے استعمال کی چیزوں میں شامل کئے جا رہے ہیں۔ یہ اصول قدرت کے خلاف خدا کی نعمتوں میں محنت کشوں سے زیادہ حصّہ چاہتے ہیں اور بھوکوں سے چھین کر جمع کرنے کے عادی ہیں حالانکہ جمع تقسیم کے لئے ہوا کرتی ہے۔ صحیح ادب صحتمندانہ جذبات کی پرداخت کرتا ہے جو تیز گام نوجوانوں کی مقتدرانہ دستگیری ہے جس کی حدود میں سوسائٹی کا وہ اڈہ نہیں ہوتا جہاں زندگی اپنی منزل سے بھٹک جاتی ہے اور بڑے سے بڑا آدمی اپنی اخلاقی قدریں کھو بیٹھتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ روحوں کی دھندلاہٹوں کے ساتھ ساتھ اجسام اپنی پناہ گاہیں خود بخود اجاڑ لیتے ہیں۔ پرانے قندیلوں کی جگہ نئے دیئے روشن کرنے والے کچھ جادوگر ہیں کچھ شعبدہ باز، اور انہیں اسی بھاگ دوڑ میں گھروں سے دور جھلی اجالوں میں شام پڑ جاتی ہے۔ ان میں بعض سر پھرے اور منہ زور ادیب اپنی خامی اور پستی کو چھپانے کے لئے قلمی اور سخنی طور پر غیبت اور تنقیص کو روا رکھتے ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اس طرح اُن کی فطرت کے نقاب کا ایک گوشہ اُڑ رہا ہے جو جبلت کے نوشتہ خانے کے سامنے ہے۔ ان کا منہ الفاظ کا ایسا پیالہ ہوتا ہے جس کا مواد سڑ گیا ہو۔

# انتخاب

کیا یہ درست نہیں کہ اقتدار کے متوالے یتیموں کے ڈھیر پر چڑھکر ہی بلند ہوتے ہیں۔ ورنہ ان کی مٹّی نشو و نما سے عاری ہے اور ان میں چوٹیلا پن نہیں ہوتا۔ یہ لوگ پنجوں اور رسموں میں امتیاز کرنے کے عادی نہیں، ان کی رتّی کے لئے تو کُتّے اور گھوڑے ایک ہی اصطبل کے جانور ہیں بعض کتّوں کو گڑ کھلاتے ہیں اور بعض گھوڑوں کو نشہ دیتے ہیں۔ اور جب ان کے ایال کھڑے ہو جاتے ہیں تو ان کے پُٹھّے تھپتھپانے لگتے ہیں تاکہ وہ لتّیاں نہ ماریں۔

اگر یہ درست ہے کہ ہزار کوڑن مل کر ایک حکیم کی جگہ نہیں لے سکتے تو حکیم اور احمق کی ایک قیمت کیوں ہے؛ اور سیاست کی

بساط پہ برابر کے مُہرے کیوں قرار دیئے جاتے ہیں۔

کہ جہاں بندر نچائے جا رہے ہوں وہاں انسانوں کے گلے میں رسّی باندھ کر ضمیر کے خلاف تعمیل حکم پر کیوں مجبور کیا جاتا ہے! جبکہ یہ مسلمہ ہے کہ سایہ ہرگز روشنی کا منصب نہیں لے سکتا۔

احسان، جبر، دولت، دوستی اور حسین وعدوں کے بدلے عوام میں اپنے متعلق نیکی اور دیانت کا اعلان کرانا کہاں تک منصفی ہے کیا یہ "تقسیم و حکومت" کے نظریہ ہی کا ایک شاخسانہ نہیں ؟ کیا ایسا آدمی برسرِ اقتدار آ کر عدل سے وفاداری کر سکتا ہے ؟ کیا ایسے لوگوں کی زندگی مجاہدانہ روایات کی امین مشقت کی عادی اور عزائم کی خوگر ہو سکتی ہے ؟ کیا یہ کائنات کے ارتقائی منازل کو نزدیک کر کے آسائشیں تقسیم کر سکتے ہیں ؟ ۔

یہ جبر و اقتدار اور انعام و تشدد کے پیش کئے ہوئے لوگ کیا اس قابل ہوتے ہیں کہ حکومت کو بے تعصبی اور منصفی سے چلا سکیں اور ہر معاملے کو غیر جانبدارانہ انداز سے سوچ سکیں ؟

○

# محبّت

محبّت عناصر کے احاطوں سے باہر کی شے ہے۔ اس لئے عناصر کا خیر و شر اسے ختم نہیں کر سکتا!

محبوب کا التفات عالمِ ہجر کے خوابوں کی تعبیر ہوتا ہے جس میں جسمانی اور روحانی مسرّتیں ایک مرکز پر آجاتی ہیں۔

جو محبت بیتاب نہیں وہ بیمار ہے اور آوارہ مزاج!

آوارہ مزاج محبت میں عیاری بھی ہوتی ہے اور غلط پیمائی بھی یہ ہرگز اعتبار کے قابل نہیں ہوتی یہ دوسروں کو دھوکا دیتی ہے اور خود تاجرانہ زندگی پر آجاتی ہے۔ اس کے شو روم میں بزرگوں کی عظمتیں اور دوستوں کے وقار پائے جاتے ہیں یہ ہر شخص کے یقین پر اپنے

اعتماد کی پرچھائیں نچاتی رہتی ہے ۔

محبّت کی بلندیاں فرقوں کی تمیز اور طبقوں کی حدود کو مٹا دیتی ہیں جیسے ہوائی جہاز سے کھیتوں کی درمیانی مینڈھیں، آبادیوں کی گلیاں اور مکانوں کے منڈیر نظر نہیں آتے لیکن بہت کم لوگ ہیں جو محبّت کی بلندیوں پر دورانِ سر میں مبتلا نہیں ہو جاتے ۔

محبّت کے معاملہ میں عموماً دیکھا گیا ہے کہ آنکھیں دل کی خاطر اور دل آغوش کی سیرابی کے لئے بیتاب رہتا ہے اور آغوش، زندگی کے تھرمامیٹر سے پارا اتارنے کی فکر میں۔ نہ جانے ایسے موقعوں پر روحوں کے کیا فیصلے ہوتے ہیں جبکہ جسم، رُوح کی زبان سمجھنے سے قاصر ہے اور روح جسم کی انگلی پکڑنے سے معذور !

جو محبّت تازہ دم نہیں رہتی وہ بسترِ مرگ پر ہے اس سے طالب و مطلوب دونوں دھوکے میں رہتے ہیں۔ وہ اتنا نہیں سمجھ سکتے کہ اب تعلق کی عظمت ختم ہو چکی۔ ایسے موقع پر اگر تحقیق کی جائے تو عشق آوارہ اور حُسن بد دیانت نکلے گا اور دونوں ایک دوسرے پر حقائق کی نافہمی کا الزام دینگے۔ حالانکہ ایسے ایسے مناظر پر حقائق کی چھانولی تک نہیں پڑتی ۔

ہر بالغ نظر انسان میں شدّت، احساس اور بلندیٔ فکر کے ساتھ ساتھ

محبّت کا جذبہ بدرجہ اَتم پایا جاتا ہے۔ لیکن اس میں مرکزیت نہیں ہوتی وہ ساری دنیا کے لئے ہوتا ہے اور ساری دُنیا اس کے لئے وہ خدا کی طرح محبّت کرتا ہے! محبّت وہ ہے جو زندگی یا موت دونوں میں سے کسی ایک پر مجبور کر دے۔ جب محبّت درمیانہ روی اختیار کرتی ہے تو اپنے مقام پر نہیں رہتی۔ کیونکہ ایسی صورت میں اخلاق کا ملمع اور ظاہرداری کا جھول دیرپا نہیں ہوتا، وہ تو ایک جال ہوتا ہے نمود و نمائش کا۔

ہر عورت محبّت کی مستحق ہے۔ اس لئے کہ ہر مرد کو تسکینِ نفس مقصود ہے۔ لیکن چونکہ تشنگیٔ نفس عارضی ہے۔ اس لئے عورت اور محبّت دونوں کی ضرورت بھی عارضی اور عارضی چیز زندگی کے لئے لابدی نہیں!

O

# نیکیوں کی ماہیت

عقبی امیں نیکیوں کو راہبر سمجھنے والے کیا اتنا بھی نہیں جانتے کہ کچھ نیکیاں تخلیق ہیں اور کچھ انسانی صفات! کیا مخلوق کسی طرح خالق کی رہنمائی کر سکتی ہے، اور کیا انسان خدا کو راستہ دکھا سکتا ہے۔

مخلوق اچھی ہو یا بُری وہ تو خالق کا مشغلہ ہے اور خالق ہی بُرائی بھلائی کے لیبل چسپاں کر سکتا ہے۔ یہ خیر و شر کے عنوان کہاں تک خالق کا عطیہ ہیں۔ کیا یہ انسان کے نفع و نقصان کے دوسرے نام نہیں؟

کیا انسان اپنے جوہرِ اعلیٰ سے نیکیوں کے کارخانے کھول کر رُوح کو آئینہ نہیں دکھاتا، اس رُوح کو جو امرِ ربی کہلاتی ہے اور کیا وہ جذبہ جو

نیکیوں کا محرک ہے نیکیوں سے بلند نہیں ؛ انسان کے یہاں اس کی کیا قدر و قیمت ہے ۔ اور اسے کیا نام دیتا ہے ۔

غالباً جذبات کے دو موسم ہیں اور وقت کی دو فصلیں ہیں نیکی اور بدی اس کے دو تلخ و شیریں میوے ہیں ۔ کبھی کبھی یہ چیزیں بے فصلی بھی پائی جاتی ہیں ۔ کیونکہ اجسام کی ساخت بھی اقسام رکھتی ہے اور تاثیریں بھی جدا جدا ۔

جب ایک تھان پر بندھی ہوئی بہت سی نیکیاں آپس کے امتیازات پر لڑتی ہیں تو اُن کے کھروں سے گناہ اڑنے لگتے ہیں ۔

اعمال پر نیکی بدی کے لیبل چسپاں کرنا انسان کا ذاتی فعل اور نیت نہیں بلکہ وہ تو اصولِ فطرت ہے جس سے اقدار کی ضمانت اور حفاظت ہوتی ہے ہر قسم کا نفع و ضرر اور جزا و سزا اس کے ذیلی پرتو ہیں ۔ اِن پرتووں کو معیار قرار دینا اخلاقی گمراہی اور خطرناک غلطی ہے ۔ موجودہ دور میں تمام پھیلتے ہوئے دُکھ اور چھائے ہوئے اندھیرے اسی کج فہمی کا نتیجہ ہیں ۔

خالقِ کائنات کا عرفان اس کی رحمت کے تنوع اور تعدد سے زیادہ کسی پہلو میں نہیں ۔ اگرچہ ہر پہلو میں یکتائی کا مظاہرہ ہے ۔ یہی رحمت ہے جو عالمِ اسباب میں آکر نیکی کا نام پاتی ہے اور جس نے اتباعِ اصولِ فطرت میں نبی صلعم کی مثال سے خود کو واضح سے واضح تر کر دیا ۔

# مزدور۔ کلرک۔ کسان اور سپاہی

بنئیے کا قلم ہو یا بادشاہ کا تاج، مزدور کی عرقریزی کے بغیر وجود میں نہیں آتا۔ اور اس کی اُجرت صرف زندہ رہنے کی اجازت ہے!

یہ عظمت و جبروت کے منارے اور پہاڑوں کی اولاد کی طرح سنگین محلات سب کسانوں، کلرکوں اور مزدوروں کی ہڈیوں پر کھڑے ہیں اور انھیں کا خون اُن کو سنبھالے ہوتے ہے۔

مزدور کی علیل زندگی جب کسی جابر حاکم یا امیر کی توانا مگر بے مسام زندگی کو آواز دیتی ہے تو وہ کھڑکیاں بند کر لیتی ہے کیونکہ امیرانہ زندگی مجرم سے زیادہ گناہ گار ہوتی ہے۔

جب کسانوں، کلرکوں، مزدوروں اور سرمایہ داروں کے درمیان

سے ایک وقت کی بھوک پیاس کے پردے ہٹ جائیں گے تو صحیح انسان مل کر ایک ہو جائیں گے۔ لیکن درمیان کے دلال نہ جانے کب تک غریبوں کے خون اور سرمایہ دار کے وعدوں پر نفس پروری کرینگے؟

خدا کا شکر ادا کر کہ تو غریب ہے تونگر نہیں، جسے خدا اپنی حضوری میں پسند کرتا ہے اس سے آرام و آسائش اور زر و جواہر چھین لئے جاتے ہیں تاکہ ہاتھ خالی اور بوجھ ہلکا ہو جائے۔

مگر زر و جواہر چھیننے والے بھی تو مجاہدوں میں شمار ہوتے ہیں اگرچہ دُنیا انھیں، ڈاکو کے لقب سے یاد کرتی ہے لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ اُن کا ایک چور دروازہ منصفی کے صحن میں بھی کھلتا ہے۔

مزدور، کلرک اور کسان عمر بھر اپنے خون سے زر خالص اور چربی سے چاندی نکال کر دنیا کو تقسیم کرتے ہیں لیکن دنیا انھیں شکریہ میں پیسہ جیسے الفاظ بھی نہیں دیتی اور اس حق تلفی کے باوجود دنیا میں انصاف عدل، رحم اور حق العباد جیسے الفاظ لغت میں اپنے اصل معنی میں مستعمل ہیں۔

ابھی شاید مزدوروں کلرکوں کسانوں اور سپاہیوں کے شاعر اور ادیب افق کے اُس پار اپنے خیالات و افکار سے اِس دَور کا کفن بُن رہے ہیں اور موجودہ ادیبوں کے تجربوں میں عنوان بدلنے کی تحریک

پر غور ہو رہا ہے !۔

مزدوروں کو یہ کیا خبر ہے کہ ان کی اولاد اُن سے بلند ہو گی جو دُنیا سے اپنے آباواجداد کا انتقام لے گی اور اُس وقت مرحوم والدین کی روحوں کو ایک دائمی کیف حاصل ہو گا۔

بادی النظر میں کوئی اپنا حق حکومت سے طلب کرتا ہے کوئی آقا سے کوئی افسر سے اور کوئی تاجر سے، لیکن اگر غور کیا جائے تو حق طلبی کے ہر حکم کی تعمیل بلندی سے نافذ ہو کر کلرک کے قلم سپاہی کے نیزے۔ کسان کے بازو اور مزدور کے جگر پر مکمل ہوتی ہے۔

دُنیا کے دلوں پر اب یہ راز بہت جلد آشکارا ہو جائے گا کہ کوئی بڑا آدمی بڑا نہیں ہوتا اور کوئی چھوٹا انسان ہمیشہ کے لئے چھوٹا انسان رہنے کے لئے پیدا نہیں ہو گا۔ فطرت کسی کو بھی تقدّس، حکومت اور سیادت کا حق دے کر نہیں بھیجے گی۔

میں عمر بھر اپنے مزدور، سپاہی، کلرک اور کسان طبقے کا ماتم کرتا رہا ہوں۔ لیکن کیا کروں ان میں تو بھی وہ لوگ پیدا نہیں ہوئے جو خود اعلٰے قوانین اور موزوں دستور بنا سکیں۔

یہ تو اونچے طبقے کے لئے عیش و عشرت کا سامان مہیّا کرنے کی چلتی پھرتی مشینیں اور پستیوں میں رینگنے والے وہ ریڑھ دار جانور

ہیں جو اپنے ہی جسموں کو ڈستے رہتے ہیں۔

لیکن ان کے رستوں میں آنے والے مقامات پر کہیں کہیں ارتقا کی مدھم سی روشنی بھی دکھائی دیتی ہے شاید ان کی نسلوں میں منہ زور مستقبل پیدا ہو رہا ہے یعنی وہ ارتقائی تشدد جو جذبات کا رُخ بدل کر دماغ کو تندرست کر دیتا ہے۔

جو سپاہی کو معلم، جولاہے کو عسکری اور وکیلوں کے کارندوں کو خزانچی نہیں بناتا۔

جو عبادت کو تجارت اور تجارت کو عوام کی خدمت نہیں سمجھتا، جو طالب علموں کو عمل کی تلقین نہیں کرتا اور بیویوں کو خاوندوں کا بازو قرار دینے سے قاصر ہے تاکہ قوتیں برقرار رہیں۔

جو اپنے اعلےٰ طبقے میں ایسے افراد رکھتا ہے جو خود بلند ہوتے ہوئے نفس پروری اور ہوس کاری سے دور رہتے ہیں اور عوام کو رُوحانی تلقین اور اخلاقی تعلیم کے آمیزہ کے ذریعہ احساس کمتری سے نکال کر خود شناسی کے راستہ پر ڈالتے ہیں۔

جن کے ارادے عمل کی قندیلیں لے کر چلتے ہیں اور جن کے پاؤں کے نیچے زمین بولنے لگتی ہے۔

جن کے جلو میں جانبازاور جری شرفا کے گروہ ہوتے ہیں۔ ان میں

بزدلوں اور وقار پرستوں کی تعظیم روا نہیں ہوتی۔ وہ مجاہدانہ قوتوں اور مدبرانہ ساز و سامان پر اکتفا کرتے ہیں۔ ان کی فطرت ضرورت سے زیادہ کے لئے دامن پسارنے کو جرم گردانتی ہے اور ضرورت معیار رکھتی ہے۔

(۳)

اس میں کیا شک ہے کہ ہر محنتی جسم ایک کشتی ہوتا ہے ساحل عشرت کی۔ لیکن ان کی روحیں تو پوست کی طرح ابھر رہی ہیں لیے خوابوں کا پوست جس میں معمولی اور خشک غذا کو بھی معدہ تشکر کے ساتھ قبول کر لیتا ہے۔

ان میں اور باربردار جانوروں میں شاید تصور اور قیاس کا فرق ہے ان میں توکل اور قناعت ہے جو جانوروں کو بے چین نہیں رکھتی۔

نہ جانے جانوروں میں دوستی کا رواج ہے یا نہیں ایک جانور دوسرے جانور کے حقوق چھینتا ہے یا نہیں۔ لیکن ان کے حقوق تو ان ہی کی شکل کے انسان غضب کرتے ہیں۔ شاید ان کے جسم بہرے ہیں، اور روحیں اندھی، اور نہ جانے یہ دونوں خصوصیتیں انسان کو جانوروں سے کہاں تک نزدیک کر دیتی ہیں۔

صحیح سپاہی کسانوں، مزدوروں اور کلرکوں ہی میں ملتے ہیں اور جب مزدور کسان اور اسی قسم کے دوسرے طبقوں میں صحیح عسکریت پیدا ہوتی ہے تو

غلط خانے اصلاح پاکر انسانیت افروز نقشوں میں مبدل ہو جاتے ہیں کیونکہ کسانوں، مزدوروں، سپاہیوں اور کلرکوں میں یک جہتی کا نام ہی تو صحیح انقلاب ہے۔ کیونکہ یہ اتحاد ہوتا ہے حقیقت، جوش، عمل اور سلیقے کا۔

جو نعرے، اذانیں اور مرثیے کانوں سے ٹکرا کر دل تک نہ پہنچیں وہ عوام کو متاثر نہیں کر سکتے اور نہ اُن کے شور سے مستقبل کی دیواروں میں دریچے کھلتے ہیں۔ یہ آسودہ حال اور عشرت پسند لوگوں کے بس کی بات نہیں بلکہ ان لوگوں کا کام ہے جن کے خون اور پسینے میں قرابت داری ہے۔ انسانی حیثیت سے مساوات تامہ ایک اہم درس اور اساسی اصول حیات ہے۔

مفاد پرستوں اور مشترک حکومتوں نے ہمیشہ اس کی تردید کی اور کسان کو دہقان، مزدور کو قلی، کلرک کو بابو اور سپاہی کو سنتری کا لقب دے کر انھیں ذلیل رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن صداقت گرد آلود تو ہو سکتی ہے معدوم نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ انقلاب ہمیشہ مفاد پرستوں کے لئے آیا۔ کیونکہ آندھی میں عموماً تناور درخت زیادہ گرتے ہیں۔

○

# خیرات

جب تو خیرات کرے تو پہلے یہ دیکھ لے کہ تیرے ارادے تیری بھوک کے سامنے دست بستہ تو نہیں اور تیرا ایثار گلے میں ہول دلی کا تعویذ تو پہنے ہوئے نہیں!

خیرات کے بعد کیا تیرا ضمیر یہ استعداد رکھتا ہے کہ اس خداوندی کے ارتکاب پر دائرہ بشریت سے باہر نہ جائے؟

عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ اوچھی سخاوت انسانیت کے ساتھ چل کر پہلے موڑ پر بدگمان اور دوسرے گھوم پر بے ایمان ہو جاتی ہے روحانی روشنیوں کا چھوک آسے نصیب نہیں ہوتا۔ وہ ذلیل گداگری سے نظر ہٹا کر پروردگاری کی ڈیوڑھی کو اپنی جاگیر خیال کر لیتی ہے۔

یہ دیکھا گیا ہے کہ خدا کے جویا سخاوت کی وادی سے ابلیس پرست ہو کر لوٹتے ہیں۔ کیونکہ روشنی نظر آنے کے بعد بہت ہی کم آنکھیں ایسی ہیں جن میں شکر کے سجدے کی موج بھی گذرتی ہے۔

عموماً خیرات پر مغرور ہو کر انسان ایسے دروازے سے نہیں گذرتا جہاں اُس کی عظمت کے اونٹ اور شہرتوں کے خچر گھٹنے ٹیک کر نکلیں۔

کم ظرفوں اور ناقص ایمان والوں کے سامنے سخاوت کے بعد خدا کا مقام نہیں رہتا اور وہ خود کو کائنات کا انچارج سمجھنے لگتے ہیں۔

نعمت پر شکر اور زحمت پر صبر۔ انسان کے ایمانی نصاب میں کہاں، ہر ادراک میں یہ صلاحیت نہیں کہ سخاوت کو معاوضہ کی چیز نہ سمجھے!۔

تیرا ادراک روح کا آقا اور حبِّ دولت اس کی ہر پالیسی کی موجد ہے مگر تو نے تو اُسے خیرات کے درخشاں قندیل میں ادھیل کر رکھا ہے۔

تیری خیرات خیرات ہے نہ سخاوت سخاوت بلکہ یہ تو تیری غیرت کو اورنگ مار گئی ہے۔ اور یہ جانکنی میں نیکی کرنا چاہتی ہے جو اس کے بس کی چیز نہیں کیا تو محسوس نہیں کرتا کہ تیرے ہاتھ پاؤں غیر محسوس طور پر تجھ سے باغی ہو رہے ہیں اور تو اُسے عمر کا تقاضا اور قویٰ کا

اضمحلال خیال کرتا ہے۔

تیری کام چور روح نے تیرے معارف کو جزدان کر رکھ دیا ہے اور وہ ریا کے غبار سے اٹے پڑے ہیں۔

تیرے سانپوں کے سر پر معصوم بزرگی کے تاج نہیں اور نہ تیرے نا لکھنو کے گھونسلوں میں ناگدون کیونکہ وہ مجبوریوں سے وہ بار نہیں ہوئے اور اُن کے کانوں نے سپیروں کے منتروں کو نہیں پیا۔

میرے کہنے پر آنکھوں کی شہادت کے بغیر اپنے کانوں کو یقین دلا دے کہ جو لوگ خیرات کے بعد خدائی کے اظہار کو پی گئے انہیں یا تو جلندر ہو گیا یا استسقا تھی۔

کاش دنیا کو حقیقی اور غیر حقیقی ضرورتوں میں امتیاز کرنا آجائے۔ اور عرفان ہو جائے کہ خاموش ضرورت مند بولنے والے سخی سے بلند مقام رکھتا ہے۔

اگر خدا سے لین دین کا تعلق رکھنا ہے تو ضرورت سے کم لے اور استطاعت سے زیادہ دے اور اس درمیانی وقفے کی ضرورتوں کو اپنا حق سمجھ؛ اس سے زیادہ غبن میں داخل ہے۔

بھک منگوں کی جھولیوں میں جیبیں الٹنے والے اُن مستحق محتاجوں سے بے خبر ہیں جن کی زبان سوال کے لئے الفاظ نہیں رکھتی۔

خیرات کے وقت تیری نظر اپنے ہاتھ پر ہونی چاہئے نہ کہ حاجت مند کے دامن پر۔ کیونکہ اس وقت اس کی خودداری اور تیری سخاوت بے نقاب ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں یہ تیرے فرائض میں بھی تو نہیں۔ خیرات کے جو معنی عوام میں سمجھے جاتے ہیں وہ میری نظر میں بلند اور مقدس نہیں۔ خیرات تو صحیح معنی میں وہ ہے کہ جو چیز خیرات کی جائے اس کی ضرورت لینے والے اور دینے والے کو برابر ہو۔ اور دینے والے کے دل میں اپنی ضرورت کی رمق تک نہ آئے۔

ایثار اور قربانی کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ دماغ سے مشورہ لئے بغیر مجبور سے مجبور سے اور کار آمد سے کار آمد شئے سے دست بردار ہو جائے اُس کے مشورے اور تفہیم کی فہرست میں عقبیٰ کے خواب بھی کابوس سے کم نہیں۔

تقسیم فطرت کا نظام اہلِ نظر کے لئے بہترین رہنمائی کرتا ہے۔ خیرات اور تقسیم کے معاملے میں آفتاب ذلیل سے ذلیل پستی کو بھی مقدس بلندیوں کی طرح سیراب کرتا ہے۔ کیونکہ اس کا یہی کام ہے کہ جو اسے دیا گیا ہے وہ معیّن عرصہ کے اندر اندر بے تعصّبی سے کائنات پر چھلکا دے اور بس۔

دنیاوی سرمایہ کے نظام کو دُنیا کا خالق ہی خوب جانتا ہے جو لوگ دنیاوی سرمایہ کے نظام میں کارِ تقسیم کو اپنا حصّہ سمجھتے ہیں، ان کی

خود اعتمادی انہیں دلدل میں لے گھستی ہے جس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ ان کا سکون ساؤنٹا نہیں ہوتا اور موت کی گرفت اوسرے نہیں باندھتی۔

جو اپنی تقسیم کی کوتاہی پر نہیں کڑھتا وہ فطرت کی تقلید کے دعوے میں جھوٹا ہے۔

غالباً خیرات سے آباؤ اجداد کی روحیں بھی مسرور ہوتی ہیں کیونکہ بڑھا ہوا پتنگ زمین پر کھڑے ہوئے انسان کی انگلی کے اشارے پر آسمانی فضاؤں میں حرکات وسکنات کا ارتکاب کرتا، اور بلندی وپستی کی طرف گھٹتا بڑھتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اصولِ تقسیم میں بلندیوں کے لئے بھی ضوابط ہیں۔ لیکن یہ بھی نظر انداز نہیں ہو سکتا کہ سورج سرخرو تو پستیوں ہی کی تقسیم سے ہوتا ہے اور یہیں اپنی خواب گاہ بناتا ہے۔

دولت مند لوگ بستی کے غریبوں میں جاکر خیرات کرنا اپنے وقار کی توہین خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ فطرت سے زیادہ عظمت نہیں رکھتے اور سورج سے زیادہ مخیر نہیں وہ اس ادراک سے بے بہرہ ہیں کہ خیرات کا عمل نیکی ضرور ہے مگر کوئی کسی کی دولت کا محتاج نہیں۔ یہ تو ایک منفعت کی شراب ہے جو فطرت کی سخاوت کی

جاسکتی ہے۔

جوہڑ کا پانی زمین پی جاتی ہے اور خشک ہونے تک وہ رُکا ہوا پانی نہ جانے کتنے امراض کا باعث ہوتا ہے لیکن نہر کا بہتا ہوا پانی کھیتوں کو سیراب اور باغوں کو شاداب کرتا رہتا ہے حالانکہ وہ بھی زمین ہی کی خوراک ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کم آب سے کم آب نہر گہرے جوہڑ سے زیادہ عظمت رکھتی ہے کیونکہ ٹھہرے رہنا خسارت ہے اور بہتے رہنا خیرات!۔

○

# سمندر

اس ناپاک خشکی میں کیا دھرا ہے؟ اپنے وزنی جسم کو سمندر کے سپرد کر دے جہاں گندی نالیاں آکر پاک ہو جاتی ہیں!۔

سمندر تو ہر زندہ چیز کو آغوش میں لے لیتا ہے اور اس کا تمام تر بار خود اُٹھاتا ہے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ سمندر مُردوں کو قبول نہیں کرتا!

سمندر تو زندگی کے ذخیرے کا نام ہے ایسا نہ ہو کہ تیری مردگی تجھے پھر ساحل پہ پھینک دے جہاں عفونتیں پیدا ہوتی ہیں اور گندے مادّے ترقی کرتے ہیں۔

بلندی پر جانے کے لئے سمندر ہی سے راستے ملتے ہیں، نورانی راستے زرّیں زینے اور نقرئی کمندیں، لیکن ان راستوں میں مسافر انگلیوں پہ

نہیں ہوتے بلکہ پہلی جست سے قبل ہی جسم جھاڑ دیتے ہیں!۔

یہ جسم کا بوجھ انسان کا بوجھ نہیں یہ تو سمندر سے دور رہنے والوں کی چیز ہے ورنہ سمندر کی نمکین ہوا تو ساحل کی آبادیوں کے دروازے اور قید خانے میں قیدیوں کی زنجیریں تک گلا دیتی ہے۔

سمندر میں جانے سے پہلے اپنا بوجھ ان لوگوں میں تقسیم کر دینا پڑتا ہے جو مرمّت طلب ہیں، جن کے پشتیبان کمزور ہیں اور جو کواڑوں میں زنجیروں کی جگہ پتھر لگا کر سوتے ہیں۔

سمندر کی زندگی میں جسم اور رُوح کا دوغلاپن نہیں رہتا وہاں تو خالص انسان کی گنجائش ہے۔ میل کچیل سے پاک انسان کی!

جب انسان سمندر ہو جاتا ہے تو اس کا کام بھی یہی قرار پاتا ہے کہ گندی نالیوں اور بدبودار مادوں کو صاف و پاک کرے اور یہ اس وقت ممکن ہے جب کہ وہ ایک بیکراں نیکی اور اتھاہ پاکیزگی بن جاتے تاکہ اس میں گناہوں کی کشتیاں عیاریوں کے شکارے اور جرائم کے جہاز ڈوب سکیں۔

جب روح کی آگ سے جسم انگارا بن جاتا ہے تو ساحل کی تیز ہوا اُسے اُٹھا کر خود سمندر کے سپرد کر دیتی ہے اور وہ بھیگ کر کوئلہ بن جاتا ہے وہ کوئلہ جسے مٹی نہیں کھا سکتی۔

کبھی کبھی یہ کوئلہ کنارے پر بھی آجاتا ہے لیکن اس کی ذاتی صلاحیتیں ضائع نہیں ہوتیں وہ یا تو آگ بنتا ہے یا پھر کوئلہ کا کوئلہ رہتا ہے اور اس کا کام ہے تعفن کو مٹانا۔

اگر وہ آگ بنتا ہے تو ہوا کے تھپیڑوں سے بنی ہوئی آگ جو پھر پانی ہی کا لباس اختیار کر لیتی ہے۔ البتہ راکھ ساحل کا جزو بنتی ہے جو کئی منازلِ تغییر کے بعد آخر سمندر سے ہم کنار ہوتی ہے؛ جن پر اپنی وسعتیں اور پہنائیاں آشکارا ہو جاتی ہیں۔ وہ خود کو سمندر کے سپرد کر دیتے ہیں۔ ورنہ اس آگاہی کا احساس دیوانہ بنا دیتا ہے۔

سمندر کی نرم موجوں کے زمزمے ہوں یا طوفانوں کی چنگھاڑیں سب تغیرات کے خطبے اور اثبات کے اعلان ہیں۔

خوش انجام موسم اور نشو و نما کے حسین اور حیات آگیں انقلابات سمندر کی امیدیں ہیں۔ جن کے جلو میں ہزار سامو تکل مسلح اور مستعد ہو کر کائنات کو شادابیاں تقسیم کرتے اور روشنیاں دیتے ہیں۔

زندہ قومیں بحری قوت اور سمندری وسائل سے موسموں کے ساتھ ساتھ عمرانی ترقیاں کرتی ہیں۔

○

# عورت

ابھی انسانی علم نے اتنی ترقی نہیں کی کہ عورت کے اقسام معلوم کر سکے۔ ابھی تو دنیا اس کے خارجی پہلو سے بھی آشنا نہیں۔
یہ ہرگز ایسی صنف نہیں کہ آسانی سے سمجھ میں آجائے کیونکہ یہ اپنے مقام سے بہت دُور نکل آئی ہے اور واپسی کے لئے اسے رہبر میسّر نہیں۔
مرد کے بغیر عورت نے دُنیا کو ایک عظیم المرتبت پیغمبر دیا ہے اور مرد اس بلندی سے محروم ہے۔
پاکیزگی اور عصمت کی صفت عورت کا کمال ہے جس سے خدا کا عرفان ممکن اور انبیار کا مقام روشن اور نزدیک دکھائی دینے لگتا ہے۔
اس صنف کی خصوصیت کا احترام اور نگرانی زندگی کا ایک اعلیٰ مقام ہے جس سے عورت کی قدر و قیمت کا تعلق ہوتا ہے۔

جب مرد بیوفائی کرتا ہے تو عورت کی مظلومیت شیطان کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیتی ہے اور جب عورت زبان درازی پر اُتر آتی ہے تو شوہر کی تسکین میں غموں کے بدرنگ پیوند لگنے شروع ہو جاتے ہیں۔

صاحبِ ولادت ہو کر عورت کے حسن میں جاذبیتیں تو بڑھ جاتی ہیں لیکن اس کا دل معمّا ہو جاتا ہے۔ اس وقت عورت میں عموماً ربوبیت آ جاتی ہے۔

جب عورت اپنی کسی معمولی بلندی سے کوئی ڈرامہ کھیلتی ہے۔ تو اپنی کوکھ سے معجز کارجن کر دکھا دیتی ہے اور جب کسی تاریکی میں بھٹکتی ہے تو پیغمبر کی پاک دامنی کے درپے ہو جاتی ہے۔ جیسے معصوم رکھنے کا فطرت نے ذمّہ لیا ہے۔ دو زبان دراز عورتوں کی آواز آرے کے دانت تیز کرنے کی اُس ریتی سے کم نہیں جو دو دانتوں کے درمیان چلتی رہی ہے۔ لیکن جب عورت تنہا محبت کے آسیب میں مبتلا ہوتی ہے تو وہ زمین پر بسنے والوں کی زندگی سے بلند گفتگو کرتی ہے۔

عورت کی نظر دوستی کے لئے آواز تو ضرور دیتی ہے لیکن اس کی تاریخ اسے امین نہیں بتاتی وہ دل کی حفاظت کے فن سے ناآشنا

اور اپنی محبّت کے حصار کو وسیع کرنے میں مہارت رکھتی ہے۔

جب عورت محبّت سے مرد کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیتی ہے۔ تو رگوں میں دوڑنے والے خون کے ذرّات آپس میں سرگوشیاں کرنے لگتے ہیں اور نگاہوں کے لئے فضا میں راستہ نہیں رہتا اس وقت محبّت کے سوا ہر شے درمیان سے ہٹ جاتی ہے۔

عورت کا دل شکوک کا محلّہ ہے جس میں محبّت کرایہ کے مکان میں رہتی ہے۔ بعض اوقات محلّے کا محلّہ اس کرایہ دار کے زیرِ اثر ہوتا ہے۔ اور بعض اوقات محلّے دار اس کرایہ دار کو دبا لیتے ہیں۔

عورت جب اپنی آنکھوں پر آنسوؤں کی جھالر لگا لیتی ہے تو بڑی سے بڑی خوردبین اس کی بینائی کا اندازہ نہیں لگا سکتی لیکن بعض حالات میں مسکراتی ہے تو غموں کا پردہ نہیں کر سکتی۔

کئی غمگین عورتوں کو شادیوں اور ضیافتوں میں دیکھا گیا ہے کہ ان کے بشرے شاداب ہونے کے باعث ایک مستقل سوگواری کے حامل ہوتے ہیں۔

جب عورت محبّت کرتی ہے تو وہ غیر شعوری طور پر اس حدِ فاصل کو اُٹھا دینا چاہتی ہے جو خوشبوؤں کے دو بڑے ذخیروں میں امتیاز کراتی ہے جسے تکلّف کے نام سے پکارتے ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتی کہ یہ

شیرازہ جہاں خوشیوں کے قطعوں کو ملاتا ہے۔ وہیں بے تکلفی سے وہ خاکے بھی وجود میں آجاتی ہے جس نے نفرت کے دو بڑے اعظم ملتے ہیں۔

شہر کی عورتوں کے بچوں میں اُن کے کمسن کردار نظر آتے ہیں جن کی کونپلیں بعض اوقات گہواروں میں ہی پھوٹنے لگتی ہیں اور یہ بچے جوانی سے پہلے اپنے متن کے پاک دیباچے ختم کر بیٹھتے ہیں جس سے ان کے چہروں پر وقت سے پہلے عقبیٰ کے آثار اُبھر آتے ہیں حالانکہ ان کے حاشیہ پر دولت اور تعلیم صف آرا ہوتی ہے اور ظاہرداری آبائی کمینگی کے پرچم لئے مغالطوں کے پوسٹر چسپاں کرتی رہتی ہے۔

محبت پسند عورت پہلی ہی ملاقات میں زندگی کے نصف پردے اٹھا دیتی ہے وہ نہ ظرف دیکھتی ہے نہ اہلیت۔ اور اس جذباتی عجلت میں وہ ایسی خوشیوں پر ہاتھ ڈالتی ہے جن کی ملکیت غموں کے سوا کچھ نہیں ہوتی عورت پر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب وہ جذبات کے جواب میں جذبات کے علاوہ کچھ نہیں ہوتی اور نہ کچھ ہونا چاہتی ہے اور یہ پیش خیمہ ہے اس کے انسانی زوال کا اور مرد کی فریب خوردگی کا!

اگر عورت اور مرد ایک خیال ایک طبیعت اور ایک ذات نہیں تو دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت اور بلند سے بلند فریضہ انہیں زندگی میں خوش نہیں رکھ سکتا پر اور بات ہے کہ وضعداری میں دونوں اپنے

اپنے جگر کے لہو کو غذا سمجھ لیں اور دوزخیوں کی طرح بسر کرتے ہیں۔

عورت مقدس شراب کا ایک سربند شیشہ ضرور ہے لیکن جب یہ ضبط مستی اور قیود کیف کے باعث خود بخود ٹوٹتا ہے تو اس سے گنارا ریاکاری محسوس ہوتی ہے اور آلودگی گناہ!

اس میں کیا شک ہے کہ عورت ایک حلاوت ہے بولتی ہوئی اور ایک موسیقی ہے مَس کرتی ہوئی لیکن جب مرد اسے شکوک کی کٹھالیوں میں رقابت کی آگ سے پگھلا پگھلا کر ٹھنڈی کر دیتا ہے تو یہ اس قدر سخت گیر اور سنگدل ہو جاتی ہے کہ اپنی رسوائی اور مرد کی موت دونوں اسے نرم نہیں کر سکتیں۔

عورت محبت کرنے پر مجبور ہے اور مرد اس سے مسرت حاصل کرنے پہ لیکن مسرت کی مجبوری وقتی ہوتی ہے اور محبت کی ابدی، اگرچہ اس میں مرکزیت نہیں ہوتی۔

اس بدبخت ملک میں اُن بیویوں کی تعداد زیادہ ہے جو شوہروں کے لئے اندھے بہرے دوستوں سے زیادہ نہیں، اور اُن شوہروں کی تعداد بھی کم نہیں۔ جن کا وجود بیویوں کے لئے صحبتِ ناجنس کی طرح ہے اُنہیں حسین چہرے توانا جسم اور تعلیمی آراستگی محبوب نہیں بنا سکتی۔ اس کے لئے تو مزاج آشنائی کا سلیقہ اور دلداری کا شعور درکار ہے۔

عورت سے بے تعلق ہو کر زندگی بسر کرنا ایک ایسا جرم ہے جو سیکڑوں گناہ ساتھ رکھتا ہے اور جرم ہو یا گناہ دونوں اپنے نتیجے میں سزا لکھتے ہیں جسے عورت کا انتقام کہا جاتا ہے اور فطرت اُسے عدل کا لقب دیتی ہے۔

مرد عورت کیلئے متانت، سنجیدگی، خودداری اور تقدس سب کو ارزاں سے ارزاں قیمت پر لٹا دینے کے لئے بیتاب ہو جاتا ہے مگر صرف اس وقت تک جب تک عورت پر اس کا تصرف نہیں ہوتا اور جب مرد کی انگلیوں کے نشیب و فراز سے لمس کی لہریں عورت کی عصمت پر جانکنی طاری کر دیتی ہیں۔ اس وقت وقیع سے وقیع اور حسین سے حسین عورت اپنی قیمت اور عظمت کھو بیٹھتی ہے! اور مرد ایک غیر منصف حاکم اور ریاکار مفاد پرست کی طرح سلوک کرتا ہے!

مرد اور عورت کو تمام تخریبوں سے بچانے کے لئے یہ ضروری ہے۔ کہ دونوں کے فطری تقاضوں کی تکمیل مذہبی اطاعت و انقیاد کے تحت عمل میں آئے تاکہ آزاد رجحانات بد طلاکت و تخریب کا موجب نہ ہوں۔

○

# حقائق

بعض حقائق کا سمجھنا گستاخی ہے اور اظہار کرنا جرم!
لیکن سمجھنا اور اظہار کرنا دونوں چٹورپن ہیں۔ جن میں خسارہ کا خیال نہیں ہوتا۔

خدا کے یہاں کارخانے نہیں۔ وہ تو غافلوں سے لیکر چاق چوبند لوگوں کو تقسیم کرتا ہے۔ اور اس تقسیم کے لئے حرام حلال کی مختلف کھڑکیاں کھلی ہوئی ہیں۔ جس نے جس کھڑکی پر ہاتھ پھیلا دیا اُسے وُہیں سے اس کا حصہ مل گیا۔ کیونکہ کھڑکی کا انتخاب مانگنے والے کے اختیار کی چیز ہے۔

کتاب کے الفاظ کی حد تک پڑھنا آواز کے نشیب و فراز

تک سننا، نظر کی حد تک دیکھنا اور آثار و قرائن کی حد تک آشنا ہونا یہ سب عوام کی باتیں ہیں۔ علم کتاب سے آگے ہے اور قابل سماعت راز آواز سے پرے ہے۔ اسی طرح نظر کی حدود اور آثار کے احاطے سے گذر کر حقیقی مناظر اور غیر فانی دنیا کی پرچھائیاں ملتی ہیں۔

ماضی کی عظمت اور دلاویزی سے کون انکار کر سکتا ہے لیکن تقلید کی انگلی پکڑ کر چلنے سے ایجاد میں ٹھوکریں کھانا بہتر ہے کیونکہ پگڈنڈیوں سے بڑے بڑے فاصلے اور موڑ کٹ جاتے ہیں۔ اور اب تک پگڈنڈیاں ہی شاہراہیں بنتی چلی آئی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ عدالتوں میں انصاف کم دستیاب ہوتا ہے۔ لیکن اگر عدالت میں صحیح فیصلے بھی ہوتے ہیں تو اس نا منصفی کو منصفی تسلیم کر کے خاموش ہو جانا چاہیئے۔ کیونکہ حاکم تو قانون سے مجبور رہے۔ البتہ انسانی قوانین سے بالاتر بارگاہ فطرت ہے۔ جہاں روحوں کو حکم اپیل سننے پر مجبور کیا جاتا ہے اور وہاں ایسے فیصلے ہوتے ہیں کہ پیغمبروں کے لئے بھی رعایت کا خانہ نہیں۔

حقیقی معنی میں بڑا آدمی سوسائٹی اختیار نہیں کرتا کیونکہ نہ تو وہ سوسائٹی کے بلند مقامات کو نظر میں لاتا ہے اور نہ سوسائٹی ایسے اہل

خیال کرتی ہے۔ سوسائٹی مطلق اس چیز سے ناآشنا ہوتی ہے کہ چھوٹے آدمیوں ہی کو بڑا بننے کا حق پہنچتا ہے۔ اور انہیں کا سلسلہ ہے جو اب تک بلندیوں پر پرچم نصب کرتا چلا آرہا ہے۔

جو لوگ نیکی کے بدلے نیکی نہیں کرتے وہ قابلِ معافی ہیں کیونکہ جو چیز اُن کے پاس نہیں اس کی تقسیم اُن کے بس سے باہر ہے فقیروں کی جھولی میں بھیک کے ٹکڑوں کے سوا کیا ہوتا ہے۔

حقیقی فقیر اور صحیح بادشاہ دونوں کی نظر میں دنیا ہیچ ہو جاتی ہے، کیونکہ غم کی فراوانی سے حقیقی مسرت کے دریچے کھل جاتے ہیں۔ جو دنیاوی نشاط سے بلند و بالا ہیں۔ اسی طرح مسرت بڑھ کر اس مقام تک پہنچ جاتی ہے جہاں سے غم اپنے اصلی خدوخال میں نظر آنے لگتا ہے اور وہ قربان گاہ ہے دُنیاوی لذتوں کی۔

○

# اکھاڑا

جسم کی طرح روح بھی کاہل، کمزور اور بودی ہو جاتی ہے یہاں تک کہ کمزوری میں مذہب، اخلاق اور مصلحت کی اڑ لینے لگتی ہے۔ کام چوری اور بہانہ سازی اس کی فطرت ثانیہ بن جاتی ہے۔ زندگی کے اکھاڑے میں جب بھی موقع ملے روح اور نفس کی کشتی کرا، اور اپنی روح کو ایسے ایسے داؤں پیچ سکھا کہ پچھڑنے نہ پائے۔ نفس عموماً گر لڑتا ہے جو اس کے استاد کی تعلیم ہے۔

سنا ہے کہ اس کے استاد نے تو ایک دفعہ قدسیوں کے پالے ہوئے پٹھے سے کشتی مانگ لی اور بازی اسی کے ہاتھ رہی۔ دیکھنے والوں نے اس کی اس جرأت اور گستاخی کو حقارت سے دیکھا مگر اس نے لنگر

گھما دیا ... . . . . . . . . . . آج تک اس کشتی پر کائنات میں سرگوشیاں ہو رہی ہیں۔

روح جب خم ٹھونک کر نفس کے سامنے آجاتی ہے تو شروع شروع میں تو اس کی سانس پھول جاتی ہے اور نتھنے خشک ہو کر بجنے لگتے ہیں۔ کیونکہ تازہ دم نفس کے دوچار جھوٹے زمین و آسماں کی طاقت لئے ہوئے ہوتے ہیں۔ مگر روحِ کی فطرت میں شکست نہیں۔ کیونکہ فاقے اس کے لئے حیاتین اور مصائب تازہ ہوا کا کام دیتے ہیں۔

نفس کے معدے میں گناہوں کے سوا کوئی چیز ہضم نہیں ہوتی کہیں کہیں اسے روح کے دروازے پر اندھے بھکاری کی طرح گدائی کرتے دیکھا گیا ہے جس کی لاٹھی میں آنکھیں ہوتی ہیں۔

مار اور پکڑ میں نفس ذاتی طور پر بھی مسرت محسوس کرتا ہے لیکن جب اسے کہیں ٹھنٹھ پر کوئی کمزور سی چڑیا یا کسی گھورے کی مرطوب فضا میں مرُدار نظر آجاتا ہے تو یہ گندے جوڑ کر گوتا ہے۔

پرانے لوگ کہتے ہیں کہ اس کا استاد معصوموں کے اسکول میں ٹیچر اور ایسا ٹیچر رہا ہے جو اپنی مجبوریوں کے ساتھ ساتھ محکمہ کے انتظامات کو حقارت آمیز نظر سے دیکھتا تھا اور منصب ترک کر بھی آج تک اپنی فتح خیال کرتا ہے

زبان کے اونٹ جب دل کی منڈی سے مال لاکر کانوں کی آڑھت پر

ڈال دیتے ہیں تو نفس کے گرگے دلالی کو دوڑتے ہیں۔ جب اچھے اور خالص مال پر زیادہ کمیشن کی مانگ ہوتی ہے یا بیوپاریوں کی توجہ نہیں پائی جاتی تو بلند روح اپنے اس دساور پر ایک کرب محسوس کرتی ہے۔

جب روح کی خوبیوں کا تفریحی وقفہ بند کر دیا جاتا ہے۔ تو عموماً خوبیاں باغی ہو جاتی ہیں، میں نے بے شمار خوبیاں تماشا گاہوں میں منہ زور برائیوں کا بانا بدلے دیکھی ہیں جن کے سینے پر نفس کی کمپنی کا نشان تمتما رہتا ہے۔

نفس کی فیکٹریوں سے غریبوں کے خون اور مساکین کی مومیائی کے پارسل جاتے ہیں۔ جو شہر کے بلند محلوں اور باہر کے بنگلوں میں دن رات ابلیس کی ذریت میں غیر حقیقی بھوک پیاس کے لئے سامان تفریح کہلاتے ہیں۔

افلاس اور مشکلات سے روح طاقتور ہو جاتی ہے مگر ایسا دیکھا گیا ہے کہ جب روح کی طاقت کا شباب ہوتا ہے تو اس کی آنکھوں پر موتیا اتر آتا ہے اور بینائی جاتی رہتی ہے۔ اعتدال کی تعلیم اب کہاں اب تو نفس کے اراکین مرکز نے ان یونیورسٹیوں کو ممنوع قرار دے دیا ہے جس میں اس قسم کے پروفیسر جمع رہتے تھے۔

چونکہ آج کل روحوں کی غذائیں خوف نہیں اس لئے ان کی ریڑھ کی ہڈی کا گھٹا ڈھیلا پڑ گیا اور اب اس میں عبودیت پر ثابت قدم رہنے کی استعداد نہیں اور یہ مرض ایسا متعدی بن چکا ہے کہ نفا نوے

فی صورتی روحوں کا معدہ کسی مفید دوا کو قبول نہیں کرتا۔

خودداری اور نفس دونوں کے مکانوں کی کھڑکیاں آمنے سامنے ہیں اور بیچ میں تعلیماتِ مذاہب کی گلی۔ دونوں کان بھی رکھتے ہیں اور آنکھیں بھی بعض اوقات خودداری کی دہلیز کی روشنی نفس کی کھڑکی تک پہنچ جاتی ہے اور بعض اوقات نفس کا سایہ خودداری کے بارجوں کو سیاہ کر دیتا ہے۔

عمر کی دوپہر میں عموماً نفس اپنے دریچے سے شفاف صورت آئینوں کی پرچھائیاں خودداری کے چہرہ پہ نچاتا رہتا ہے جس سے چھائیاں پڑ جاتی ہیں اور رفتہ رفتہ صورت مکروہ ہو جاتی ہے۔

اس مقدس اور مظلوم انسان کی پیغمبری میں کیا شک ہے جس نے کہا تھا کہ "محبت کے قابل معصوم بچے ہی ہیں" اس لئے کہ بچپن کی عمر میں شیطان کی آمد کے لئے دروازہ نہیں ہوتا وہ تو مرکب ہوتا ہے خالص روح اور جسم کا، مگر چونکہ جسم میں نشو ونما ہوتی ہے اس لئے رفتہ رفتہ نفس کی آمیزش کے باعث جسم کا ملبا روح پہ بوجھ بن جاتا ہے جس سے آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں۔ اور پاؤں تھرتھرانے لگتے ہیں۔

جب نفس اپنی من مانی کر چکتا ہے تو زندگی بیچ سامنے ایک ایسی عبری مگر سرمئی بادلوں سے اٹھی ہوئی اتھاہ گہرائی دیکھتی ہے جس کا

سرمایہ ہوا کے ساتھ نہیں بہتا اور جیسے سورج کی شعاعیں رنگینی کرنے سے قاصر ہیں۔ اس وقت محسوس ہوتا ہے کہ پاکیزگی اس حقیقت کا نام ہے جو خون کے ذرات کی روح ہے زندہ، بیدار اور غالباً پائندہ و پوشیدہ۔

نفس زیادہ دیر تک زندگی کے حقائق اور پاکیزگیوں کے تھپیڑے نہیں کھا سکتا چنانچہ جب دماغ بیدار اور حقائق بالغ ہوتے ہیں تو نفس خود بخود کمزور ہوتا چلا جاتا ہے۔ کچھ دنوں کے بعد ایک دھندلے نور میں تبدیل ہونے لگتا ہے اور اس کے قدم تیزی سے مرکز کی طرف اٹھتے ہیں۔ ایسے میں بعض بعض مقامات پر نفس کو پاکیزگیوں کا محافظ دیکھا گیا ہے۔ عموماً جسم اپنی کوتاہ اندیشی اور عشرت پسندی کے باعث نفس کے اشاروں پر چلنے لگتا ہے۔ لیکن جب تھک جاتا ہے تو شرمندہ ہو کر اس کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ اس وقت انسان اپنے ایمان کی دنیا میں طلوع سحر کی کیفیت محسوس کرتا ہے۔

جسم میں بھی بولتے ہوئے حقائق موجود ہیں لیکن نفس کے اڑائے ہوئے گرد و غبار میں اٹتے چلے جاتے ہیں۔ اور یہ گرد و غبار صرف آنسوؤں سے دھل سکتا ہے۔ احساس گناہ اور محبت کے آنسوؤں سے جب نفس جسم کو نیکی اور عبادت کی تلقین کرتا ہے اس میں اس کی

نیت شامل نہیں ہوتی بلکہ اپنی کمزوری، خامی اور نارسی کا پردہ مدِ نظر ہوتا ہے۔

نفس کے گرد ایسی سعادتیں بھی نظر آتی ہیں جو لطافت کی پیاسی ہیں مگر اس قدر بھولی اور کمزور کہ جب وہ دور کی معصومیتوں کو نزدیک لے آتی ہیں تو نفس شب خون مار دیتا ہے اور وہ مجوب ہو کے رہ جاتی ہیں۔

اس وقت ایک متعفن، اندھیرے کے سوا کوئی روشن پگڈنڈی نظر نہیں آتی۔

نفس اور روح کے متوازن ہونے کا نام انسانیت ہے اور غیر متوازن و عدم انضباط کو مجروح انسانیت کا لقب دیا جاتا ہے۔ زندگی کی تمام تر کیفیات اسی صورت و ترتیب سے وابستگی رکھتی ہیں۔

ان میں ایک حالت سے فرشتگی کی سچائی مشتق ہے اور دوسری سے انسانی معراج۔ روح و جسم کا ربط و توازن کہیں تو فرقوں کے باڑوں میں آکر کشف و کرامات کے لفظ سے عالم آشنا ہو گیا، اور کہیں بصیرت و دانائی سے انفرادی و اجتماعی نظامِ حیات کی کامیابی کا دارو مدار اسی اعتدال و اتصال کے ایک موسم کا نام ہے۔ اور ہر قانون اور ضابطہ کا حاصل۔

# دانائی

اصیل قسم کا دانا کبھی بیوقوفوں کی تلاش میں سرگرداں نہیں رہ سکتا۔ وہ جہاندیدہ اور بالغ نظر ہونے کے باوجود جرم اور گناہ کا وظیفیا نہیں ہوتا۔ نجیب الطرفین دانائی دست سوال دراز نہیں کرتی وہ تو اپنے سرمایہ کی تقسیم سے خوش ہوتی ہے۔ اس کی نظر میں زمین کے اچھوتے دگڑے اور دریاؤں کی دوشیزہ پہنائیاں رہتی ہیں۔

وہ تو سپر ہوتی ہے ہلاکتوں کی اور موئید ہوتی ہے امن وسکون کی اس کا محبوب مشغلہ مسافروں کی خدمت اور زادِ راہ کی امداد ہوتا ہے۔

اس کے وعدے اپنی ایفاء کے لئے شرط نہیں رکھتے نہ اس کے اعمال جزا کا فریب کھاتے ہیں۔

اس کی ایجادات و اختراعات تاجرانہ جذبہ کا نطفہ نہیں ہوتیں
وہ تو جزو ہوتی ہیں کائنات کے آرائشی جذبے اور ربوبی ارادے کا۔
اس کے جذبے کبھی بھول کر بھی اپنے لئے قواعد پیدا نہیں کرتے
وہ تو فاطبتہً دوسروں کے لئے ہوتی ہے۔

صحیح دانائی ماحصل ہوتی ہے اپنے اوصاف و محاسن کا اور
وہ محاسن اپنے گرد مقاصد کی جھالر نہیں رکھتے، جو تحسین و ستائش
کے دھاگوں سے ٹانکی جاتی ہے۔

وہ اپنے کارناموں پر لجاجت کا اظہار کرتی ہے اور یہی اس
کے بس کی بات ہے۔ وہ جہاں جہاں گذرتی ہے درس و تدریس
کے مراکز قائم ہو جاتے ہیں۔

بے لاگ دانائی اپنی تربیت خود کرتی ہے اس کے پیشِ نظر نہ
جہنم کے شعلہ زار ہوتے ہیں نہ جنت کے پھول۔ وہ اپنی فطرت کے
اقتضا سے ہر سانس پر ایک قدم آگے بڑھ جاتی ہے۔

اس کا باطن روشن اور ظاہر مضمحل ہوتا ہے کیونکہ جب یہ روشنی
ملتی ہے تو جسم اپنی آرائش سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور انسان اپنے
ضمیر کی حفاظت کا ذمہ لے لیتا ہے۔

دانا انسان دانائی کے اس عطیہ کو لے کر فطرت ہی کے قدموں

پر نثار کر دیتا ہے اور نہ معلوم یہ سنکھیا اس کے لئے مسرت ہے یا خود روح فطرت کے لئے نشہ۔

مکتبی علوم اور سطحی آگاہیوں سے دور اور بہت دُور جا کر کیفِ شعور اور توفیقِ رسائی کی پگڈنڈیاں شروع ہوتی ہیں اور وہیں سے فکر و کردار کے ماورائی روابط کو حقیقی حوالوں سے قائم کیا جاتا ہے۔

دانائی کی روشنی کے بغیر زندگی ہدایت کے اکتساب اور حقیقی کوائف کے ماخذوں تک پہنچنے سے قاصر ہے۔ لیکن یہ بھی بھول نے کی بات نہیں کہ جرمِ دانائی ہے۔ اور عزم تحریک رسائی اور حوصلہ مندی ان دونوں کے تناسب مساعدت کی ضامن ہوتی ہے۔ اس عالم میں انسان معلوم کو معقید بناتا اور مفید باتوں کو معلوم کرتا ہے۔ اور عموماً فطرت زندگی کے راز اُنھیں کی خلوتوں میں کھولتی ہے۔

انسانی الجھنیں نادانی کا عطیہ بے شعوری کا ہدیہ اور کم سوادی کا تحفہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس عالم میں آدمی نہ دیکھنے سے عبرت حاصل کرتا ہے نہ سننے سے بصیرت نہ مشاہدے سے تجربہ اور نہ تجربہ سے مفاد!

○

# ذاتیات

سرمایہ پرستوں سے کہہ دو کہ سکوں کی جھنکار سے صحیح شاعر نہیں خریدا جا سکتا۔ ہاں سیم و زر کی مکر چاندنی ان ذلیل شاعروں کو فریب دے سکتی ہے، جن کے کلام میں دولت کی نمک خواری جھنجھناتی ہے! مزدور شاعر تو اپنے مزدوروں، کسانوں، کلرکوں اور سپاہیوں کا نمک خوار ہے اور انھیں کے گیت گا کر خوش ہوتا ہے۔

میں اپنا ایمان کتوں کے مراتب کے بدلے نہیں بیچ سکتا کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ زندگی کے خالی ہاتھ ہی دعا کے لئے بلند ہو سکتے ہیں۔

میں جب بھی پیاسا سو گیا ہوں رات بھر کنواریوں کے پنگھٹوں، باؤں کے کناروں اور پہاڑوں کے آبشاروں سے ہمکنار رہا ہوں۔

میں نے کبھی دنیا سے آرام مانگا تھا تو اس نے مجھے مشکلات اور مصائب کے ذخائر دے دیئے اور اب مشکلات چاہتا ہوں تو گلدستے مجھ سے پڑتے ہیں۔ نہ معلوم یہ دنیا کی ستم ظریفی ہے یا میرے فکر کی بلوغت!

میں بے شک پامال و خراب ہوں اور اس دور کے نا اہل میرا شرب قبول نہیں کرتے۔ لیکن یہ لوگ میری ہجو کے مستحق بھی نہیں۔ کیونکہ یہ تو اپنی ہی دلدل میں لت پت ہو کر غرق ہو رہے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ میں ضرورت کے مطابق دنیا میں تقسیم ہو رہا ہوں۔ لیکن ابھی میرا وہ حصہ باقی ہے جسے دنیا نہیں جانتی اور میں پریشان ہوں کہ اسے کہاں تقسیم کروں۔ جبکہ موجودہ بہروپئے اپنی تنقید سننے پر آمادہ نہیں اور یہ زمانہ مجھے نیا دور پیش کرنے سے روکتا ہے!۔

جب میں کسی مفاد پرست تاجر کی پارٹی میں جاتا ہوں تو ایسا محسوس کرتا ہوں کہ وضعدار لوگ شرافت کا عُرس کر رہے ہیں۔ اور ان میں غریبوں کا حق تقسیم ہو رہا ہے۔ لیکن شکریہ کا اظہار نہیں۔

میں زندگی کی اُس منزل میں ہوں جہاں سے احتیاط کی حد شروع ہو جاتی ہے۔ ہوا کی معمولی رمق میرے گناہوں کے جھنڈے کو لرزا دیتی ہے۔ اور مجھے کنپٹیوں تک جھرجھری آجاتی ہے۔ مجھے قانون کے مجاوروں اور مذہبی اجارہ داروں میں نوجوانوں کے لئے خطرناک خیال کیا جاتا ہے۔

کیونکہ یہ دونوں ادارے دنیا کو ابھی روشنی میں دیکھنا پسند نہیں کرتے یہ ہرگز نہیں چاہتے کہ ماضی کے خیالات سے لدی ہوئی روحیں تھکن کا غبار جھاڑ دیں اور یہ کھلی فضا میں دُھوپ لینے لگیں۔

عمر کا بہترین حصہ برباد کر دینے کے بعد بھی میں یہاں خود کو اجنبی پا رہا ہوں۔ اگرچہ اب میں آزاد ہوں۔ مگر اس جنگل میں خطرہ ہی خطرہ ہے میں شیر کی طرح فضاؤں میں ذقند لگانا چاہتا ہوں۔ جیسے وہ آگے کے دونوں پاؤں آگے اور پیچھے کے پیچھے پھیلا کر دُم کی محراب کا آخری سِرا پیشانی پر ٹیک دیتا ہے اور اس کے اس انداز سے مردانہ آزادی ظاہر ہوتی ہے۔ مگر ہر شکاری اس سے کہاں خوش ہوگا۔ یہ تو کھال بیچنے والے لوگ ہیں۔ میں ان کی ہر جنبش کے سائے کو آگے آگے دیکھتا ہوں۔

جن لوگوں کو میں حکام کے دروازوں اور امرا کی بارگاہوں میں خستہ حال دیکھتا ہوں۔ ان میں کچھ درخشاں معرفتیں بھی نظر آتی ہیں۔ مگر انھیں اُن کے گھریلو کُتوں نے کاٹ کھایا ہے جس سے ان کی روحوں میں رعشہ پیدا ہو گیا اور وہ صحیح اندازہ اور تحلیل نفسی سے قاصر ہو گئے۔

جب میرے سیاسی گہوارے کی پینگ مستقبل تک پہنچتی ہے تو مجھے دقت کے سوا کوئی ساتھی نظر نہیں آتا۔ اس کے باوجود میرے گرد و پیش جمود ہی جمود ہے۔ نہ جانے جو میں دیکھتا ہوں وہ اوروں کو بھی نظر آتا ہے

یا نہیں۔

جب میں اپنی فکر کی بلندی سے اِدھر اُدھر نظر دوڑاتا ہوں، تو زمانۂ حال مجھے خانہ بدوشوں کا ڈیرا معلوم ہوتا ہے۔ جہاں کتے بھونکتے اور گدھے چرتے نظر آتے ہیں۔ کہیں اُپلوں کا دُھواں اور کہیں فرسودہ خیمے۔ کچھ عورتیں ہیں، کچھ زنخے جو مردوں کے لباس میں ملبوس ہیں۔ ان کے چہروں پر وقت کی اموات اور نیکیوں کی شہادتوں کے نشان پریشان بنتے چلے جا رہے ہیں۔ لیکن یہ آئینہ نہیں دیکھتے اور ایک دوسرے کو جانکنی میں پاکر مطمئن ہیں۔

میں موت کی بلندی اور آزادی کے ذائقے سے آگاہ ہوں۔ لیکن تنہائی کا عادی نہیں۔ میں ان سے علیٰحدہ ہو کر مرنا بھی پسند نہیں کرتا۔ اور ان کے ساتھ جینے کو بھی زندگی کی ہتک خیال کرتا ہوں اور یہی کشمکش میرا لاحق مرض ہے۔

ان کے مذہب کی اعضا شکنیاں اور عقائد کے کسل میرے پیشِ نظر ہیں۔ ان کے مفلوج خیالات اور مسلول ارادے مجھ سے پردہ نہیں کر سکتے اور ان کے بنجر ضمیروں کے شجروں کو میں اچھی طرح جانچنا جانتا ہوں۔

یہ وہ وقت بھول گئے ہیں کہ اِن کی لاشوں سے گورکن پرہیز کرتے

تھے اور مقابر کے لئے زمین نے دروازے نہیں کھولے۔ یہ زندہ بستیوں میں سانس لیتے تھے اور مر کر عفونتوں میں تحلیل ہو جاتے تھے۔

یہ لوگ بہرے ہیں اور سنتے نہیں کہ زمانہ ہر قدم پر پا بہ رکاب رہنے کا حکم دے رہا ہے۔ اگرچہ ان کا نماشتی چمڑا اُتر چکا ہے اور ان کے جسم مکروہ ہو گئے مگر یہ ابھی تک اُسی ہوا میں ہیں۔

ان کے جعلی خیالات سنکھیا نہیں پھانکتے اور ان کی دروغ گوئی اپنی کھڑکیاں بند نہیں کرتی۔ اُن کی حسرتِ گناہ اب بھی بھیڑئیے کی طرح ہونکتی پھرتی ہے اور نفس کے دانتوں میں ابھی نوکیں باقی ہیں۔ یہ سب اُس ماحول کی کوکھ سے پیدا ہوئے ہیں۔ جو بچہ جنتے ہی مر گیا ہے۔

اس سے قطع نظر کچھ مقامی بستیاں بھی ہیں۔ جو روز بروز تاریک اور گہری ہوتی جا رہی ہیں۔ ان کی نیتوں نے عمامے اتار لئے ہیں۔ اور جب بھی وہ منظر عام پر آتی ہیں تو شور مچ جاتا ہے۔ یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر اپنے کمزور مچانوں پر بھروسہ کرتے ہیں۔

یہ جہاد اور جنگ کے نام سے نیندوں میں بھی چونک چونک اُٹھتے ہیں۔ اُن کے ناشتوں میں غریبوں کا لہو اور حرام جانوروں کا گوشت ہوتا ہے۔ مگر کون تحلیل کرے؟

ان کے مقالے خیالی بدہضمی ہیں۔ اور ان کے چہروں پر زرد خوشیاں۔

جھوٹی ہنسی ہنستی ہیں۔ ان کی آنکھوں میں سے مگرمچھ جھانکتے ہیں اور ان کی شادابیاں اونچی اونچی ریاکاریوں کے سائے میں شب باشی کرتی ہیں۔

یہ لوگ پست نیکیوں اور بلند بدکاریوں کے قائل ہیں کیونکہ ان کا علم کوڑھی اور بصیرت بے چراغ ہو چکی ہے۔ آسمانی راز ان کے ذہنی اڈوں پر نہیں اُترتے۔ یہ لوگ فضا بدلتے ہی انسانیت سے مستعفی ہو گئے۔ جیسے شام پڑتے ہی شپرکیں فضا کے سیاہ اور حریری پردوں پر لپکنے اور پنجے مارنے لگتی ہیں۔

ان کے ضمیروں میں گناہوں کے بوجھ سے دبی ہوئی عفونت ان کے تبسم سے نمودار ہوتی ہے جسے بہت کم لوگ پہچانتے ہیں۔

لیکن میں ان کا بھی ساتھ نہیں چھوڑ سکتا میں تو اپنے راز ان کے سینوں میں انڈیلنا چاہتا ہوں خواہ بے محل ہی کیوں نہ جائیں۔

میں اپنے جنون کے ڈاک خانہ سے انہیں بشاشتوں کے پارسل اور آنسوؤں کے پیکٹ روانہ کرتا ہوں اور ان کی بے انصاف صندائی اُنہیں وصول بھی کر لیتی ہے مگر ان کے سینوں میں تشکر کا داخلہ بند ہے۔ مجھے ان پر رحم آتا ہے کیونکہ زمانے نے ان کے قدم اکھاڑ رکھے ہیں اور یہ مستقبل کے خیال کی حدت سے پھُنکے جا رہے ہیں۔ لیکن پھر بھی

یہ کھوکھلے ستونوں کا سہارا نہیں چھوڑتے۔

یہ جانتے ہیں کہ میرے منہ کا کف ان کے لئے زہرِ آب ہے اور میرا پسینہ تیزاب سے کہیں تیز! کیونکہ یہ زندہ ضمیری اور تلخ حقائق کے اصل ذائقہ سے ناآشنا ہیں۔ اسی لئے یہ میرے خیالات کو دبا دینا چاہتے ہیں۔

میں نے ان کے احاطوں میں داغ بیل لگا دی ہے۔ مگر ابھی وقت کا ریلا میرے ساتھ نہیں آیا اور ان کی سیرتوں میں صاف ہوا کے دریچے کھلنے میں دیر ہے اور نہ جانے کب سے میری موت اس منظر کی منتظر ہے! اور میں اپنی فطرت کے خلاف ان سے محبت کرنے پر مجبور رہوں اور جی رہا ہوں۔

میری نظر میں ان کی بڑی خطائیں قابلِ معافی ہیں۔ لیکن معمولی غلطیاں نظرانداز کر دینے کے لائق نہیں کیونکہ معمولی غلطیاں تو بے پرواہیاں کہلاتی ہیں نہ کہ غلطیاں۔

○

# دوسرا باب

گورستان میں کتبوں کی بھرمار دیکھ کر دل میں آگ جلنے لگتی ہے کہ سرمایہ داروں اور مادہ پرستوں نے مرنے کے بعد بھی غریبوں کے لئے زمین تنگ کر رکھی ہے اور یہاں بھی ان کے امتیازی پرچم سرنگوں نہیں۔

شام کے وقت جب مزدوروں کو چھٹی ملتی ہے اور کلرک اپنے اپنے گھر واپس ہوتے ہیں تو ان کی بے آب پیشانیاں انقلاب کی زمین کی کیاریاں معلوم ہوتی ہیں۔ ان کے بوسیدہ اور میلے کپڑوں کا سایہ مفاد پرستوں کے مستقبل میں ایک اونچے شہ نشین پہ ناچتا دکھائی دیتا ہے جس سے تسلط اور اقتدار کا دم اُلٹ جائے گا۔

کسی بلند عمارت پہ کسی ایک مفاد پرست کو قابض دیکھ کر رگوں میں

نوں وردین کر گردش کرنے لگتا ہے اور نظر اُن راہ نشینوں پر جم جاتی ہے جو سڑکوں پر ٹاٹ کے ٹکڑوں میں رات بسر کرتے ہیں اور جن کی عورتیں غیر شعوری طور پر انقلاب جنتی ہیں۔

دیہات کے کھیتوں میں کسانوں کا لہو شاداب اور پسینہ بار آور دیکھ کر اُن پر فطرت کی اولاد کا یقین ہوتا ہے اور جب ان کے گزی گاڑھے کے پھٹے پرانے کپڑوں اور مٹی کے گھروندوں پر نظر جاتی ہے تو شہروں کے محلات کی بنیادیں لرزتی محسوس ہوتی ہیں لیکن فطرت عجلت پسند نہیں اور نہ اُسے بھول کی عادت ہے

ہزاروں مزدوروں اور کلرکوں پر ایک مل کے مالک کو خدائی کرتے دیکھ کر میں اپنے خون میں آپ اونٹنے لگتا ہوں کہ اس غلط تمدن نے فطرت کے نظام کو کس قدر اُلٹ پلٹ کر دیا ہے۔

کئی بار جب میرے سامنے سے بدکاریوں کے جلوس نکلے تو میری نیکیوں نے خودکشی کر لی اور میں ہاتھ ملتا رہ گیا۔

ہزاروں فلک بوس مکان میرے دیکھتے دیکھتے زمین پر آرہے جن کی مسماری کے متعلق میرا اندازہ مدت کی میعاد میں غلطی کر رہا تھا اب یہ شاندار تخریب نہ جانے کس بلند مرتبہ تعمیر میں بکھری جائے گی کیونکہ خوبصورت صندوقچیوں اور نفیس ترین چوکیوں کو بنانے کے لئے مضبوط اور تناور

درختوں کو جڑ سے ڈھانا ہوتا ہے۔

وہ حساس دل اور بیدار ضمیر اطمینان کی سانس کیسے لے سکتے ہیں۔ جو یہ سمجھتے ہوں کہ بیواؤں کی عصمتیں محفوظ نہیں۔ یتیموں پر خدمتگاری میں قمچیاں برستی ہیں اور اساتذہ شاگردوں کے راستوں میں دیواریں بن گئے۔

میں نے دیکھا کہ میرے مکان میں مجھ سے پہلے کرایہ دار کا ماضی سو رہا ہے میں اس کے قریب گیا تو وہ میرے پاؤں کی چاپ سن کر بیدار ہو گیا اور اُٹھتے ہی میرے حال سے متعارف ہوا، میرے حال نے چپکے سے اس کے کان میں نہ جانے کیا کہا کہ وہ پھر سو گیا! غنودگی میں اس کے ہونٹوں پہ یہ فقرہ بھنبھنا رہا تھا کہ انقلابات بعض اوقات نامانوس قلمیں بھی باندھ دیتے ہیں اور یہ شاخیں بڑا توانا پھل دیتی ہیں۔ لیکن اصلیت سے اُن کا کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔

# ہمدردی

بعض اوقات ہمدردیاں انسان کو کاہل، سُست، بے عمل اور حرام خور بنا دیتی ہیں کیونکہ جو امداد کے خوگر ہو جاتے ہیں اُن میں خود اعتمادی کی جبنی ہوئی تدبیرِ حیات کم ہو جاتی ہے۔

جب انہیں ایک مقام پر بیوقوف قسم کے ہمدرد نہیں ملتے، تو اُن کا یہ فن انہیں مختلف مقامات دکھاتا ہے اور اسی ذلیل زندگی کی عادت اُنہیں نصرتوں کی گلیوں میں پھرا کر بڑھاپے کے اُس اندھیرے اور گرد آلود جنگل میں چھوڑ دیتی ہے جہاں موت کی حدیں دور سے جھٹکے دیتی رہتی ہیں۔ کئی نوجوان اسی طرح تباہ ہو گئے۔

جب کسی باغیرت نوجوان کو ہمدردانہ جذبات میسر نہیں آتے تو وہ

رحم دلوں کے حلقوں کی تلاش سے نظر ہٹا کر کسی ایسی فضا کا سہارا ڈھونڈتا ہے جو اس سے کام لے اور زندہ رکھے۔ اس کے بعد اس کی ترقیوں کے راستے مسدود نہیں وہ ہمیشہ اپنے بازوؤں سے پرواز کرتا ہے اور اُس کے پس خوردہ سے مستحقین سیر ہوتے ہیں۔

ہمدردی کے لئے بھی بڑے سلیقے کی ضرورت ہے ورنہ ہمدردی پر حماقت کی مُہر لگ جاتی ہے۔

ہمدردی کے جذبے میں خود کو کھو دینا اور قابلِ امداد کے مستقبل پر نظر نہ رکھنا خود سے دشمنی کے مترادف ہے کیونکہ اس طرح تقسیم ہونے کا جذبہ رُک جاتا ہے۔

بعض اوقات قابلِ امداد کے جعلی شکریہ اور بے رُوح دعاؤں کی آوازیں وہ جذبۂ ہمدردی بھی چھین لیتی ہیں جو ہمدرد کی اس عبادت کا محرک ہوتا ہے۔

معاونین کے طبقے میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو قابلِ امداد کے ظرف و ضمیر کا کھرا کھوٹا پن پرکھ لیتے ہیں، لیکن وہ اپنی سیرت کے اُس افلاس سے آگاہ نہیں ہوتے جو عوام کو پست بنا دیتا ہے۔

ہمدردی مادی عطیات و انعامات پر منحصر نہیں بلکہ بلند خیال وسیع اخلاق، راسخ عزم اور اعلیٰ مقاصد کی تلقین و تعلیم بھی عین ہمدردی ہے اتنا

ضروری ہے کہ نیکی کا یہ مقام بڑی دشوار گذار گھاٹیوں اور حوصلہ شکن آزمائشوں کے بعد نصیب ہوتا ہے جس میں جگہ جگہ انفرادیت نہیں بلکہ اجتماعیت کے کارخانے ہوتے ہیں۔

ہمدردی کا میلاد انفرادیت کے محلوں میں نہیں ہوتا بلکہ اجتماعیت کی نو آبادیات میں اس کے سلام پڑھے جاتے ہیں۔ جہاں زمین و آسمان ایک ہی سلسلے کی چیزیں ہیں۔ اور کوئی متنفس اپنی انفرادی پریشانی میں مبتلا نہیں بلکہ دوسروں کے زخموں پر پٹیاں باندھنا محبوب مشغلہ ہے اور ایثار کا شدید جذبہ دلوں میں جھمک رکھتا ہے۔

ہمدردی ایک کیفیت ہے اعلیٰ فضائل اخلاق احساس کی۔

انفرادی ہمدردی بھی ہمدردی ہی کہلاتی ہے لیکن اصل میں وہ سعادتِ شعور ہوتی ہے اور جب یہ ہر دلعزیزی کا درجہ حاصل کر لیتی ہے تو اجتماعی صلاحیتوں کی صف میں آجاتی ہے۔ اس وقت اس کا مشغلہ تمدن کی شائستگی اور تہذیب کی مشاطگی قرار پاتا ہے۔

بیمار بصیرت کے حمل سے نابینا ہمدردی پیدا ہوتی ہے جو زمین کے سینے پر ایک ناروا بوجھ کا اضافہ کرتی رہتی ہے۔ اور زندگی کے چراغوں پہ دامن مارتے پھرنا اس کا شغل ہوتا ہے۔

# غلامی کی خصوصیات

غلاموں کی بے اعتنائی سے مشرق کے دو دریا ملک سے بیزار ہو گئے اور آزادی کی حدود متحرک ہو ہو کر رہ گئیں۔ اس میں عوام بے قصور ہیں۔ اور خود غرض ارکان اقتدار کے ساتھ جعلی پیشوایان مذہب مجرم! کیونکہ ان کے علم نے جائز بچے نہیں جنے، بلکہ کمزور اور بودی جماعت پیدا کی جو مغربی تہذیب کا پیوند ہو گئی!

ابھی تمدن، تہذیب، دماغ، علم اور سیاست آزاد نہیں۔ لوگ انھیں غلامی کی زنجیروں پر نازاں ہیں اور اسی جھنکار کے خوگر۔ یہ اپنی آزادی کے شانوں پر بھی غلامی کا چہرہ چڑھا دینا چاہتے ہیں۔ کیونکہ اب ان کے نطفوں میں وہ پارا ہے

جیسے سورج نے قبول نہیں کیا اور نہ زمین پی سکی!

غلام قومیں جب ظرف و ضمیر سے بغاوت کرتے کرتے صداقت سے منحرف اور سہولت پسند ہو جاتی ہیں تو کم از کم ایک نسل تک ان کا یہ زہر کم نہیں ہوتا۔ ان کے دلوں سے اجتہاد کا جذبہ کوچ کر جاتا ہے اور اُنہیں فقیروں سے بھیک لیتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ ان کا سینہ ان کی عارضی یادداشتوں کا قبرستان ہوتا ہے کیونکہ ان کی ذہانت صداقت اور حافظہ بے غبار نہیں رہتا۔

غلاموں میں دوستی کا جذبہ پروان نہیں چڑھتا یہ لوگ رشوت کو چھپانے کے لئے حکّام کی خیرخواہی میں ابال گراتے رہتے ہیں۔ ان میں تربیت کا سلیقہ اور تنظیم کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ اتفاق سے اگر ان میں کوئی صاحبِ نظم پیدا بھی ہوتا ہے تو یہ اُسے پھیل دینے سے پہلے دفن کر دیتے ہیں۔

حدودِ انفرادیت میں پھلنے پھولنے والے غلام کسی صورت میں بھی خود کو آزاد نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ وہ تو حرص و ہوس کی خندقوں میں گھرے رہتے ہیں۔ انہیں کیا خبر کہ آزادی کتنی وسیع چیز ہے۔ ان کی زندگی تو جوہڑ میں لوٹتی رہتی ہے وہ تو ایک گداگری ہے اور ذلیل گداگری!

اُس سے تو شعبدہ باز بہتر ہیں جو ہاتھ کا کمال رکھتے ہیں اور چوری نہیں

کرتے اور نہ مقروض ہوتے ہیں۔

ان اندھے غلاموں کو بینائی کس طرح دی جا سکتی ہے۔ اور ان کے سینوں میں احساس کی آگ انڈیل دینا کیوں کر ممکن ہے جب کہ ان کے ظرف میں سوراخ ہی سوراخ ہیں۔

یہ تو جھوٹے اخبارات کی جعلی خبروں اور بودی سیاست کے ہر جگہ پٹی لیڈروں پر یقین کرتے ہیں۔ انہیں مطلق معلوم نہیں کہ جب رشوت خوار حکومت اور بد دیانت پیشوا مل جاتے ہیں تو ہر فرقہ کی کوکھ سے کمیونزم پیدا ہوتا ہے۔

یہ غلام قوم قرض کی ذلّت اور بھیک کی پستی پر نظر نہیں ڈالتی۔ یہاں تو امریکہ سے آئے ہوئے پرانے کوٹ بکتے ہیں۔ یہ اُترن پہنتے ہوئے شرم محسوس نہیں کرتے۔ یہاں تو ایک سائیکل پر تین تین آدمی لد کر چلتے ہیں۔ ان سے اختراع کا مادّہ چھن گیا اور اب یہ ایجاد بندہ پر زندہ ہیں مگر گندگی کی طرف خیال نہیں کرتے!

ان میں ان کی قومی خصوصیات معدوم ہیں۔ ان کے چہرے ان کے شجروں کے مطابق نہیں۔ یہ تو مشکیزے ہیں نہ کہ فوّارے: ان میں ذاتی پانی کہاں یہ تو یونہی بھرتے اور خالی ہوتے رہتے ہیں۔ ان کا نہ گھر ہے نہ گھاٹ!

یہ اپنے ماضی کے زرکار لبادوں میں مغربی تہذیب کے بدرنگ پیوند اس قدر لگا چکے ہیں کہ اصل زمین کا پتہ نہیں چلتا۔ ان کے ہونٹوں پہ متقدمین کے افسانوں کی سرسامی گفتگو کروٹیں لیتی رہتی ہے۔ ان کے دل ابھی تک اُسی دوغلی پالیسی میں غرق ہیں، جو ایک غلام اپنی ماں کے پیٹ سے لے کر پیدا ہوتا ہے۔

ان کے ذاتی افکار و خیالات مغربی مصنفین کے مضامین میں دب چکے کیونکہ ان کا مطالعہ یک رُخا ہے اور اپنی حدود سے ناآشنا! ایسی صورت میں غلامی کی معیاری خصوصیات خود بخود بلند ہو کر زہریلی ہو جایا کرتی ہیں!

ان غلاموں نے اپنے مذہب کے اعلیٰ مقاصد سے منہ پھیر لیا۔ کیونکہ ان کی زندگی کوکین کی عادی ہو گئی جس سے زبان بے سکت ہو جاتی ہے اور دماغ و دل میں رشتہ نہیں رہتا۔ یہی نہیں بلکہ آئے دن ان کے اجسام میں کھولت اور ناکارگی اپنے آثار ابھارتی رہتی ہے۔

جہاں سے روئی باہر کے ممالک میں بھیجی جاتی ہے۔ وہاں کے لوگ پیوندوں کے لباس میں رہ کر خوش ہیں اور یہ وہ چیز ہے جو غلامی کی تعلیم میں ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ کیونکہ بڑے غلام

ایک ایسی حکومت کی فکر میں رہتے ہیں جس میں چند افراد ملک کی خداداد دولت اور انسان کے فطری سکون کو لوٹ کھسوٹ سکیں جو ان کے اساتذہ کی خصوصیت ہے۔

خدا کو علیم وخبیر اور سمیع وبصیر جاننے والے اجسام اگر اپنے اعمال و اقوال پر غور کریں تو اپنے دعوے کی دلیل سے قاصر ہیں، کیونکہ غلامی کی ورزش سے ان کی روح کے خدوخال مسخ ہوگئے، اور ان کی زبان اُن کے دل کا پیغام نشر نہیں کرتی۔ ان کے ضمیروں کی پتیاں بھری ہو چکی ہیں۔

غلامی کے جنے ہوئے حکام قانون کے سطحی مطالعہ سے آگے نہیں بڑھتے۔ انہیں حقائق کی گہرائیوں میں ڈوبنے کا وقت نہیں کیونکہ ان کے نیچے سے مذہب کی زمین نکل چکی ہے وہ تو حرص کے پتیلے ٹیلوں پر کھڑے ہیں جو رشوت اور مقاصد کی ہوا سے کھسکتے رہتے ہیں۔

غلام قومیں حقائق سے منہ پھیر کر فرائض کو نظرانداز کر دیتی ہیں، جس سے ان کے انجام میں تاریکی کے تتمے اور بطلان کے ضمیمے بڑھ جاتے ہیں۔ کیونکہ سورج کی طرف پشت کرنے سے سایہ سامنے آجاتا ہے۔ کیا ہر شام درختوں کے سائے طویل نہیں ہو جاتے؟

غلامی میں علم ایک کند تلوار سے زیادہ نہیں جو برائے نام کمر میں لگی تو رہتی ہے لیکن برش سے عاری ہوتی ہے۔ جہاں مردوں کی کمر میں اس قسم کی تلواریں نظر آئیں وہاں کی زمین انقلاب کی امیدوار ہوتی ہے اور رستے ویرانی چاہتے ہیں مخلص کو چاہیئے کہ ان احوال کو سنواریں تاکہ ملک برباد نہ ہو۔

غلامی سے دلوں میں کمزور اور مردہ آرزوئیں پیدا ہوتی ہیں جن کا عدم اور وجود برابر ہوتا ہے اس لئے ان کے گھروں میں آوارہ غم گھس آتے ہیں اور جب یہ اپنی اولاد کے لئے گنجائش کم دیکھتے ہیں تو ایک ذلیل موت کو قائم مقام کر کے خود روانہ ہو جاتے ہیں۔

غلام نچے ناتوانوں اور کمزوروں کو آسمانی پرواز کی امیدیں دلاتے ہیں۔ حالانکہ ان کے بازو اپنی اڑان کے لئے بھی کافی نہیں ہوتے اور انگنی پر بیٹھے یاس و امید کے سنگم پر لرزتے رہتے ہیں۔

برخوردار غلط اور اوچھے لوگ غلطی سے اپنے کھوکھلے اور جعلی تار و پود کو مضبوط اور پائیدار سمجھ لیتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ فطرت اپنی چنگاری کی گرمی اور روشنی کبھی ختم نہیں کرتی ظاہری صورتیں جس قدر حوصلہ شکن ہوں رحمت اتنی ہی قریب آجاتی ہے۔ اُبھرنے والی قومیں ان رموز سے آگاہ ہیں۔ اس لئے وہ کسی نہ کسی صورت میں مساوات کی تزویج میں کوشاں ہیں اور یہی ہے آزادی۔

# اشارات

خدا کا شکر ادا کر کہ تو بھنگ کے کھیت میں نہیں بانس کے جنگل میں ہے جہاں شاخیں ہواؤں کے اشاروں پر ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں اور پتے جھنجھنا رہے ہیں۔

دیکھ وہ دُور کناروں پر آسمان کی جھالر گلابی ہو گئی اور اندھیرے کے ذخیرے پر روشنی لپکتی معلوم ہوتی ہے۔

آگ لگ چکی ہے اور چاروں طرف سے بڑھ رہی ہے۔

بہتر یہ ہے کہ جہاں تو خود کھڑا ہے وہاں بھی آگ لگا دے اور خود سرسبز جنگل کی طرف بڑھ جا۔ تاکہ جب تک چاروں طرف کی آگ بڑھ کر

؎ یہ ایک خط ہے جو میں نے اپنے ایک دوست جگدیش چندر کو لکھا تھا

تیری حدود تک آئے تو تیرا جنگل میدان ہو جائے جہاں شعلے مر جاتے ہیں۔ اور راکھ کھاد بن جاتی ہے جو معاون ہوتی ہے آئندہ پیداوار میں!

جب یہ تیرا جنگل صاف ہو جائے گا، تب ہی تیری نظر اس سرے سے اس سرے تک پہنچ سکے گی۔ اور تیری آبادی کا صحیح جائزہ ہو سکے گا۔

میرے جنگل میں تو کھیتوں کے جو گرد ناگ پھنی کی باڑیں اور درختوں میں زقوم کے احاطے کھنچے ہوئے ہیں اور ان کے شجرے کہیں ایک دوسرے سے نہیں ملتے۔

تیرے جنگل کا تو دستور رہا ہے کہ گھنیرے اور تناور درخت اپنے آس پاس کے کمزور پودوں کو اچھی اور وافر غذا نہیں دیتے۔ ان میں کوئی مرکزی تصور ایسا نہیں جہاں یہ من حیث الشجر ایک ہوں۔

تیرے جنگل میں بھی طبقے ہیں اور فرقوں میں حسد و نفاق کے ٹیلوں سے تخریب کا دھواں اُٹھ رہا ہے جس سے اُن کی بلندیوں کے نشیب آدم خور ہو گئے لیکن یہ موسمی مرض ہے۔ تخمی اعتبار سے سب چھوٹے بڑے درخت یکساں ہیں۔ غیر شعوری طور پر اس جنگل کے باسیوں میں کچھ اصول ایسے بھی ہیں جن سے کردہ گناہ ناکردہ ہو جاتے ہیں۔

تیرا جنگل تو قابلِ رحم ہے جہاں "جو کرنی بھرنی" کا عقیدہ عام ہے۔

# لکھے پڑھے آرام طلب

یہ اُن چوپایوں میں ہیں جو اپنی خوراک لوٹ کر یا ہونٹ پھڑپھڑا کر ہضم کرتے ہیں۔ ان کے دماغی محلّوں میں مصنفین کے تصورات، اور خیالات سکونت اختیار کر لیتے ہیں اور یہ انہیں اپنی رعایا سمجھ کر اُن سے مکان نہیں چھڑاتے حالانکہ وہ ہر مجلس میں ان کی چغلی کھاتے ہیں۔

یہ اس بات سے بالکل ناآشنا ہیں کہ ہمارے گھر پھٹے ہوئے نہیں بلکہ ہمارے چھیننے سے رستوں میں سموں کے نشان بنتے ہیں اور ہمارے نقصان پہ جگالی کا جھاگ نہیں ملتا۔

غالباً یہ لوگ بددیانتی کرتے ہیں قوم سے، علم سے، استاد سے اور زندگی سے۔

ان کی زندگی قرض لے کر واپس کرنے کی عادی نہیں جب وقت ان سے فرائض کی ادائی کا مطالبہ کرتا ہے تو یہ لسانی گلال اڑا کر اپنی جبلت کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ کائنات انسان کو جینے کے زریں اصول قرض حسنہ کے طور پر دیتی ہے۔

یہ لوگ مطلق نہیں جانتے کہ جب ایک خیال اپنی جگہ خالی کرتا ہے تو دوسرا ناشائستہ خیال اس کا قائم مقام بنتا ہے، جو کے لئے تو مضر ہے۔ لیکن روحانی پیاس کو اس قدر بڑھا دیتا ہے کہ تشنگی آسمانوں پر چشمے تلاش کرنے دوڑتی ہے۔

بے حوالہ آگاہی اور بے مقصد معلومات کو تعلیم قرار دینے سے وہ اوصاف حسنہ پیدا نہیں ہو سکتے جو تہذیب افکار اور ترتیب امور کے لئے زندگی میں ضروری ہیں۔

محسوس اور ٹھوس حقائق روح کی بیداری سے اپنی ہم آہنگی چاہتے ہیں اور نارسائی کی گھنگھور تاریکیاں بےبسی اور درماندگی پر مصر ہیں مگر صحیح معنوں میں علم وہی قرار دیا جا سکتا ہے جو اس تضاد و تخالف کو اپنے پورے جمال کیساتھ حیات آرا بنائے۔ اس میں شک نہیں کہ ان مباحثات پر غور و فکر ضروری ہے جو ابدی اور ہمہ گیر ہیں اور یہ غور و فکر ہر ایک کے بس کا روگ نہیں لیکن یہ دیکھا ہے کہ زندگی کی لگامیں انہی سے تھنچتی ہیں۔

# دوستی

دوست ہر رنگ دوست ہونا چاہئے۔ اسی لئے یہ بہت سوچ سمجھ کر قبول کرنے کی چیز ہے!

دوستی کا ہاتھ بڑھا دینا کوئی مشکل بات نہیں لیکن دوستی کا نباہنا دشوار ترین منزلوں سے گزرنا ہے کیونکہ اس میں خود کو نظر انداز کرکے دوسرے دل کی حفاظت فرض ہو جاتی ہے۔

دو دوست بگڑ کر ہمیشہ کے لئے علیحدہ نہیں ہو جاتے، کیونکہ بوسیدہ ہونے سے پہلے کوئی مسل داخل دفتر نہیں ہوتی اور دوستی کی بوسیدگی کے زمانے سے پہلے پہلے دلوں کے زخم بھر جاتے ہیں لیکن نشانات میں عمر بھر دکھ رہتی ہے۔

ناداں دوست اپنے دوست کے عیوب کو محاسن کی طرح عالم آشنا کرتا ہے۔ جو لوگ نادان دوستوں سے اپنے راز نہیں چھپاتے کچھ دنوں کے بعد اس کے نتیجے میں اُنہیں صحیح دوستوں سے بھی راز داری کی ضرورت پڑتی ہے جو کم نقصان رساں نہیں۔

ضمیر کو دیکھنے دل کو پرکھنے، کردار کو جانچنے اور ایثار کا تجزیہ کرنے سے پہلے دوستی کا یقین دلانا اور اعتبار کرنا دونوں برابر کے جرم ہیں جن کی سزا کسی وقت خود تجویز کرنی پڑتی ہے۔ لیکن ہمدردی کے لئے کردار کو جانچنے اور حسب نسب پوچھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ اس مقام پر تعلق اور دوستی شرط نہیں ہوتی بلکہ دل کا اشارہ اور رُوح کی آواز۔ یہ بھی بھولنے کی چیز نہیں کہ ہمدردی کو دوستی نہیں کہتے، ہمدردی میں شکریہ کا موقع تو آ سکتا ہے لیکن شکایت کا محل نہیں!

معاشی اشتراک، تقسیم نقدی اور اپنی قیمت لگانے میں بہت کم دوستیوں کو دیانت دار اور بہت کم مدعیان وفا کو اپنے مقام پر پایا گیا ہے۔ اس لئے دوستوں میں اتنا فاصلہ ضرور رہنا چاہئے، جس سے عیوب انلارج نہ ہو سکیں اور محاسن دھندلے نہ پڑیں۔

○

# مفاد پرست

ان کی وراثتی دولت ان کے آباؤ اجداد کے ایمان کی قیمت ہے۔
ان کے حصے میں ضمیر اور شرافت نہیں بلکہ اجداد کی ضمیر فروشی کی چوکیداری ہے
ان کا بدبودار ضمیر اپنے گرد جھوٹ کا حصار کھینچ کر بیٹھا ہے۔!

یہ گندے پانی میں کانٹے ڈالنے کے عادی ہیں ان کے دماغ
لاشوں کے دھوئیں میں سیاہ ہو کر عاری ہو چکے!

یہ اپنی نیندوں میں مٹھاس گھولنے کے لئے غریبوں کا خون سکھا کر
سفوف تیار کرتے ہیں۔ بعض ایک رقیق اور رنگین عرق، یہ حرام کے
روغنی لقموں کے لئے شیطان کے ہاتھ پر بیعت کر چکے ہیں۔

ان کی غلطیاں سنگین اور جرم ضدی ہیں یہ سب کا اعتماد حاصل کر کے

اپنا اعتماد محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ اِن کے کارخانوں میں دوستی کے جعلی سکّے اور وفاؤں کی جھوٹی مہریں ڈھلتی ہیں، یہ خود انسان نہیں بلکہ انسانوں کے ناکام نقّال !۔

سُورج چڑھتا جا رہا ہے رفتہ رفتہ ہر سایہ دفن ہو جائے گا، اور ہر ذرّہ قہقہے لگائے گا۔ وضعدار ستارے ان کی گدّیوں پر نظریں جمائے۔ وقت کے خونی بیڑ کا انتظار کر رہے ہیں کیونکہ یہ خود پڑی کے ماہر انسان شناسی سے بے بہرہ ہو کر جینا پسند کرتے ہیں۔

ان کی خباثت کی کوکھ سے گداگر پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں انگلیاں نہیں ہیں۔ یہ تو تمہاری بغل میں بازو دے کر تمہارے ہاتھ کو اپنانا چاہتے ہیں۔ ان سے مصافحہ کے بعد انگلیاں گن لینا چاہئیں، مبادا کوئی کم ہو گئی ہو!

انہیں مردار سے بدبو نہیں آتی اور حرام اِن کے جبڑے نہیں بگڑتا۔ یہ اُنہیں سے ڈرتے ہیں جن کے افلاس کے دانت نکیلے اور گرفت مضبوط ہوتی ہے۔ جن کی مایوسیاں اِن مغرور اور فلقے وضعدار ہوتے ہیں، جو مشکل کو تِل اور ہر سہارے کو غیبی ہاتھ خیال کرتے ہیں۔

ہمدردی اور منصفی کو اِن کی ہمسائیگی بھی راس نہیں آتی۔ ان کے معاملہ میں سمجھاؤ اور حوصلوں میں بلندی کا داخلہ بند ہو چکا ہے۔

ان کے چہروں پر تھوتھنی والے جانوروں کا شبہ ہوتا ہے۔
سکوں کی جوت نے ان کی آنکھوں کی بینائی کم کر دی ہے۔
یہ عادی مجرم اور آبائی گناہگار ہیں۔ اس لئے معمولی نیکیاں بھی بدی کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔

ان کی دوستی چاندنی پر صبح کے دھوکے سے کم نہیں اس سیاہ دریا میں مچھلیاں کہاں یہاں تو مگرمچھ جنم لیتے ہیں۔ ان کے بھیانک گُنڈے آدم خور ہیں آدم خور!

ان کی نظر عیّاش ہے اور دل مفت خور، ان کے سینہ کے نوٹس بورڈ پر سیاہی ہی سیاہی ہے اور ان کی قسمتوں سے فرشتوں نے نیکیوں کے عنوان کاٹ دیئے ہیں۔

یہ زندگی کے سونے کو کیسے پرکھ سکتے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں تو سفید موتیا اترا ہوا ہے۔

ان کے اخلاق غلامی کے شاگرد ہیں اور ان کی جرأتیں بوڑھے زنکوں کی طرح بزدل اور ذلیل یہ اپنے بیوی بچّوں سے بھی تجارت کرتے ہیں۔ ان کے اخلاق بودے اور بدنیت دار ہیں۔ ان میں بعض احمق دولت اور ثروت کے گنگناتے چراغوں سے صداقت کی تلاش کرتے ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ مفاد پرستوں اور بے انصافوں

کی رہنمائی کا واحد ذمہ دار شیطان ہے۔

ان کی سرتیں منافقت کے دودھ سے موٹی ہوتی ہیں اور فریب کی غذاؤں سے جوان ہو کر زندگی میں گڑھا کر دیتی ہے جس کو عمر بھر جیب تراشی سے پاٹنا زندگی کا بہترین مقصد قرار دینا پڑتا ہے

ان کی دوستی سے ڈاکوؤں کی خدمت اچھی، جن کے دل مرد اور جرأتیں بالغ ہوتی ہیں وہ دن بھر مخبر رہتے ہیں اور رات کو منصف!۔

اِن کے یہاں تو دوستی کی قیمت اور جاں نثاری کا صلہ صرف جھوٹے وعدوں کے سبز باغ ہیں۔ اور اپنے مقصد کی حدود اور غرض کی چہار دیواری تک تجھے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

اگر تو ان کے عقائد کی کوٹھریوں میں جھانکے تو سانپوں کی آنکھوں کی روشنی اور کونوں کھدروں میں چھچھوندروں کے سڑے ہوئے جسم ملینگے جنہیں سانپوں نے اُگل دیا ہے۔

جس طرح ہو ان سے اپنی ہمدردی کی بھیک منگوا اور التفات کی گدائی کرا یہ تو اچھے انسان اور دوغلے درندوں کی درمیانی صنف ہے کچھ تو ان میں ایمانوں کی لاشیں اٹھائے پھرتے ہیں، اور کچھ اپنے بیمار عقائد کے اسٹیچروں پر جھکے ہوئے ہیں۔

ان میں وہ آگ کہاں جو کلام کرتی ہے اور وہ پانی کہاں جو بصیرت

رکھنا ہے۔

یہ بیداریوں سے خائف درندے سوئے ہوئے لوگوں کے تلوے چاٹنے کے خوگر ہیں۔ اِن کی زبان میں زہریلے کانٹے ہیں جن سے گدگدا کر زہر داخل کرتے ہیں۔

اگر تیرا ظرف اجازت دے تو انہیں دھکیل دے کر اتنا بڑھا دے کہ یہ بیٹا چھوڑ دیں۔ ان کے حواریوں اور مصاحبوں سے رشک کیا معنی وہ تو بھوکے اور دو غلے کتے ہیں جو اس تمدّن کی کھٹی قے پر گرے پڑ رہے ہیں۔

جب مفاد پرستی آقائی کے آسیب میں بڑبڑاتی ہے اُس وقت اس کے عزائم زبان میں آجاتے ہیں اور آسیب زدہ اپنے شجرے اس طرح مرتب کرتے ہیں۔ کہ اس میں ان کے اجداد کے پوپلے گناہ اور بوڑھی غداریاں بھی بولنے لگتی ہیں۔

مفاد پرستوں کے دوغلے ضمیروں کی اتالیق شیطان کی ایک مہذب اور مخصوص جماعت ہوتی ہے جو اُن کے تصورات اور خیالات کے افق تک ایک بوجھل وسواس پھیلا دیتی ہے۔ جس کی تاثیر مسموم اور خواب آور ہے۔ اُس سے اُن کا یقین چندھا اور سماعت کے نقارے گیلے ہو جاتے ہیں!

مجھے ناقص الایمان مفاد پرستوں سے باتیں کرتے وقت محسوس ہوتا ہے کہ میرا نطق ٹوٹی ہوئی اینٹوں کے ڈھیر پر چڑھ رہا ہے۔

اُمرا کی حرص و ہوس کا اندازہ بہت دشوار ہے کیونکہ یہ جاننا بہت مشکل ہے کہ کتنا اس کے ہاتھ میں ہے اور کتنا آرزو میں!۔

سرمایہ داروں کے بچے عموماً اپنے حال کو بلند مستقبل پر لے جانے سے قاصر ہوتے ہیں کیونکہ فطرت ان کی پشت پناہی نہیں کرتی بلکہ شیطان کی ایک مستعد جماعت اُنہیں لوریاں دے دے کر زندہ رکھتی ہے۔

سرمایہ دار باپ غالباً یہ نہیں سمجھتے کہ انسان عورت کے بطن سے خود ہی پیدا ہوتا ہے اور بچے وراثت میں باپ کی خصوصیات پاتے ہیں کیونکہ یہ باپ کی روح کی شاخیں اور جسم کی بیلیں ہیں جن میں گردش کرنے والا عرق بیج کے خلاف پھول پھل دینے سے معذور ہے۔

جب مفاد پرست بلند مقامات اُس کا ساتھ چھوڑتے ہیں۔ تو صدیوں کا انتقام لے کر جدا ہوتے ہیں کیونکہ زورِ بازو کی حلال کمائی سے بلند عمارتیں ممکن نہیں بلکہ ایمان فروشی، خیانت، سود اور حق تلفیوں سے۔ اور ان بدعنوانیوں کا مرتکب لازمی طور پر خود پرور ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہر قلعہ نما مکان ایک ہی فرعون کے تصرف میں نظر آتا ہے۔

○

# درمیانہ طبقہ

درمیانہ لوگوں سے ہمیشہ بچو کہ درمیانی راہیں سنسان گھاٹیوں سے گذرتی ہیں اور غم آلود جنگلوں میں چلی جاتی ہیں۔ جہاں کسی موسم کا گذر نہیں ان کی دنیا میں نہ خدا کی تجلیات ہیں نہ شیطان کے شعبدے۔ نہ وہاں گمراہوں کے غول ہیں نہ ہادیوں کے محلّے۔

ان کے یہاں کامیابیوں کی برسات نہیں آتی اور نہ ناکامیوں کے بازار لگتے ہیں۔ یہ ایسے دیہات میں رہتے ہیں جہاں ذہنی طاعون پھیلا ہوا ہے۔

اس گروہ کے آسمان پر جانکنی کے جلول سایہ رکھتے ہیں جس سے گومگو کا عالم رہتا ہے۔ یہ نہ تو زمین کی گود میں چین سے سوتے ہیں اور

نہ انہیں سورج کی روشنی میں فرار ہوتا ہے۔

یہ لوگ دو حصّوں میں منقسم ہیں۔ ایک سزا کے خوف میں جیتا ہے، دوسرا جزا کی امّید میں مر رہا ہے۔

یہ لوگ اپنے سایوں پر کھڑے ہیں اور ان کا سایہ مستقل ہو گیا ہے! نہ انہیں اپنی منزل کی پہچان ہے اور نہ زمانہ ان کا تعاقب کرتا ہے، یہ لوگ محبّت نہیں کر سکتے کیونکہ ان کی زبان تلخ اور شیریں دونوں ذائقوں سے متعارف نہیں۔ یہ تو اُس برساتی پانی پر گرتے ہیں جو رستوں کے کناروں پر گرمیوں میں سُورج کی حدّت سے نیم گرم رہتا ہے۔

یہ لوگ نیکی کے بے وفا دوست اور بدی کے نادان دشمن ہوتے ہیں انہیں جنّت نے تھوک دیا ہے اور جہنم کے گلے میں اٹکے ہوئے ہیں۔ یہ یہ زندگی کو موسموں کی مناسبت سے استعمال نہیں کرتے۔ یہ جذبات کے جوار بھاٹا میں جھاگ کی طرح ہیں۔ مؤافق اور مخالف ہواؤں سے ان کا دُور کا بھی تعلق نہیں!۔

یہ محبت، آزادی، مذہب اور آرزو کے دلدادہ تو ضرور رہتے ہیں مگر یہ تمام چیزیں تاروں کی چھاؤں میں ان کے دروازے دیکھ کر واپس ہو جاتی ہیں۔ اور انہیں کواڑوں پر دستک کے نشان اور چوکھٹ پر نقشِ قدم ہی ملتے ہیں۔ کیونکہ یہ تمام عظمتیں وقت کے

برق رفتار گھوڑے پر سوار آتی ہیں اور کاہلوں کا انتظار نہیں کرتیں۔

یہ لوگ روئی کے ڈھیر کی طرح بے مغز مگر بلند زندگی کے طالب ہوتے ہیں اور فطرت ان کے لئے اس میں سے بلندی کی تخفیف کر دیتی ہے۔ یہ اکتفا کے ڈھنڈورچی اور اعتدال کے ایجنٹ ہمیشہ سڑکوں پر قناعت کے پوسٹر چپکاتے پھرتے ہیں۔

ان کی نظر کسی چیز کی تگڑی سے اوپر نہیں جاتی اس لئے یہ ہمیشہ اُن اشیاء کے آرزومند ہوتے ہیں جو فطرت کے کونوں کھدروں میں پڑی رہتی ہیں۔ اور ان پر پھپھوندی لگ کر سانپ کی چھتریاں اُگ آتی ہیں۔

خواص کبھی ان سے بحث نہیں کرتے کیونکہ صداقت کبھی باطل سے دوبدو نہیں ہوتی اور معارف ہرگز ایسوں کے سامنے پردہ نہیں اٹھاتے یہ لوگ تو تشریح چاہتے ہیں۔ اور خواص میں اسے تضیع اوقات کا نام دیا جاتا ہے۔

○

# تعلیم و تربیت

تعلیم کا مقصد تخلیقی داعیہ سے مکمل آگاہی اور وہ ذہنی نشو و نما مراد لی جاتی ہے جس سے انسانیت کے اخلاقی اور روحانی پہلو روشن اور اُجاگر ہو جائیں۔

لیکن ان شاگردانِ فرنگ میں تو تعلیم سے صرف جمالیاتی شعور پیدا کیا جاتا ہے۔ اور اُسے آرٹ کا لقب دے کر کج اندیش لوگوں کو اس افیون کا عادی بنا دیا جاتا ہے۔ ہر چند کہ اُس کی لَے میں اخلاقی جراُت اور روحانی تڑپ نہیں ہوتی۔

موجودہ دور میں تعلیم کے راکین پست و کشاد کماں نہیں سمجھتے ہیں۔ کہ جمالیاتی شعور تو اخلاقی حدود کے بغیر رفتہ رفتہ فحاشی پر اُتر آتا۔

ہے اور اِس ماحول کی بے غیرتی، دیّوسی اور ملّت سے بغاوت اُسی غلط تعلیم کا نتیجہ ہے۔

جس نظریۂ تعلیم میں تعلیم ایک پارٹی کے ذاتی اغراض کا آلہ اور اس کی خود غرضانہ حکمت عملی کی محتاج ہو کر رہ جائے۔ وہاں فطری قوانین اور اسلامی اصولوں کی گنجائش نہیں رہتی۔ کیونکہ غیر فطری نظام تعلیم تو لادینی کو جنم دیتا ہے جس سے مذہبی جذبات کی شدت بےحسی اور بے غیرتی میں بدل جاتی ہے اس کا نظریۂ تعلیم تو صرف پالیسی کے واضعین کے مفاد کو پورا کرتا ہے

اس قسم کے نظام تعلیم میں کبھی ایسے تنقیدی اور اصلاحی پروگرام کامیاب نہیں ہو سکتے جو کسی رُخ سے بھی بانیان نظریہ کے مقصد سے ٹکرائیں اور حقائق کی طرف رہنمائی کریں۔

یہاں تو یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ اساتذہ خود اپنے ذہین۔ فطین شاگردوں کی ترقی کے راستے روکے ہوتے ہیں اور کتابوں کے پبلشروں کے حسب منشا نصاب تعلیم مرتب ہوتا ہے مصنّف اور طالب علم کے درمیان سے اگر پبلشر کا سوال اٹھا دیا جائے تو تعلیمی شعبہ کی بہت سی مشکلات حل ہو جائیں اور مصنفین ہی نہیں بیز عوام کے ساتھ ایسا سلوک ہے جس کا رشتہ ربوبیت سے مل جاتا ہے

لیکن اس دور میں تو ایسی تجویزیں میں بھگنے سے پہلے ہی رجسٹر فوت و پیدائش میں درج ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ شیطنت کبھی صداقت کے آئینے میں منہ نہیں دیکھتی۔

تعلیم کے خیال اور تربیت کی دیگر کوششوں سے پہلے جسمانی صحت محفوظ رکھنے اور احتیاط کرنے کی چیز ہے، اس کے بعد کیرکٹر جو زندگی میں ریڑھ کی ہڈی کی طرح ہے۔

اس کے بعد تعلیم ہے جو حیات انسانی کی ستر پوشی میں تہ بند کا کام دیتی ہے اگرچہ جب خود غرضیوں، ریاکاریوں اور ضرورتوں کے جھکڑ چلتے ہیں تو ہر تعلیمی تہ بند طول و عرض معلوم ہو جاتا ہے اور ہوا کا ہر جھونکا بتے اڑا کر زندگی کو دور تک عریاں کر دیتا ہے!۔

تعلیمی سلسلے میں تفریح اور کھیل بھی اس طرح ہیں جیسے اُمرا میں کھانے کے بعد پھل اور مفلسوں میں گُڑ!۔

میرے خیال میں بیڈ منٹن، برج، فلش اور اسی قسم کے کھیل عزت کی نظر سے دیکھے جانے کے قابل نہیں، البتہ گھونسہ بازی، بنوٹ، پیراکی شمشیر زنی، غلیل کشتی اور نیزہ بازی ایسے فن ہیں جو علم کے ساتھ جزو بدن ہو جاتے ہیں۔ اور زندگی خود بخود ایک توانائی اور شگفتگی محسوس کرتی ہے

تعلیم میں دین، سیاست، اقتصادیات، اگر انیات تاریخ جغرافیہ،

نفسیات، فلسفہ اور سائنس ایسے مضامین ہیں جنھیں حیات کے سرچشمے کہا جا سکتا ہے۔ جن سے سیرابی کے بعد قوم کے بچوں کی جوانیوں سے ہزاروں امیدیں وابستہ ہو سکتی ہیں۔

یونیورسٹیوں کے کارکناں یہ جانتے ہیں کہ وقت کے لحاظ سے جس شعبہ کو بلند اور کارآمد سمجھا جائے اس کے مبادی اور مفاد کے ساتھ ساتھ اس کے مشاہیر کی سوانح عمریوں کے ذریعہ ان کی پاکیزگی اور عظمت کو ذہن نشین کر لینے سے قوت اعتماد میں پختگی اور ارادوں میں استحکام آجاتا ہے غالباً یہاں نوجوانوں کی بہبود مقصود نہیں بلکہ مقاصد اور اغراض کی حفاظت مدِنظر ہے یہ لوگ تو کشتی کے سوراخ ہیں۔ ان کی رگوں میں علم صالح خون پیدا نہیں کرتا ان کا مزاج تو بلغمی ہے اور گلاب بھی ان کے حلق سے اتر کر تھوک بن جاتا ہے۔ یہ نہیں جانتے کہ بڑی جماعتوں کے اہم مضامین کو پانی کر کے ابتدائی جماعتوں سے ہی استعمال کرایا جا سکتا ہے انہیں معلوم نہیں کہ اگر بچے کو ایک سال میں سو الفاظ بھی لکھنا پڑھنا اور سمجھا دیئے جائیں۔ تو بارھویں جماعت میں طالب علم بارہ سو الفاظ کا مالک ہوگا مگر انہوں نے تو شاید اپنے استادوں کو بھی بارہ سو الفاظ کا مالک نہیں دیکھا ہوگا۔

نہ جانے بیچارہ دار زندگی کو وقت کے تقاضوں کی تعلیم سے

کب تک محروم رکھیں گے۔ اور عوام میں کب بیداری آئے گی اور یہ غریبوں کو کب تک دھتکارتے اور امراء میں کب تک علم فروخت کرتے رہیں گے؟

لوہار کو جلد سازی سکھانے اور درزیوں سے بڑھئی کا کام لینے والے اراکین تعلیم کیا جانیں کہ کرسی نشینی اور چیز ہے اور نفسیات تعلیم دوسری شے!

یہ کیا جانیں کہ بچپن عمر کا ایسا موسم ہے جس میں دھوپ زیادہ نہیں پڑتی اور علمی، تمدنی، سیاسی، معاشی اور عسکری تعلیم کے مسالے زندگی میں جذب ہو کر مضبوط ہو جاتے ہیں۔

جب عمر کا سورج جوانی کی اٹھارہویں بلندی پر چمکتا ہے، تو اس وقت حدت کے باعث کوئی علمی اور تعمیری رنگ نہیں چڑھتا بلکہ سوکھ کر درزیں دے دیتا ہے اور جگہ جگہ پپڑیاں اکھڑ جاتی ہیں جس سے کیرکٹر کی خوبصورتی قابلِ اعتماد نہیں رہتی۔ کیونکہ وہاں سے تو تقسیم کا وقت شروع ہو جاتا ہے نہ کہ تحصیل کا۔

کیا یہ ملک اور قوم کے لئے شرم کا مقام نہیں کہ انہیں اپنے علوم و فنون دوسری زبانوں میں پڑھائے جائیں۔ اور ان کی معاشرت کو اجنبی معاشرت کا رنگ دے دیا جائے اور اس طرح

کہ دماغ دھنتے کا بھی خیال نہ ہو۔

نوجوانوں کی اسی خامی کا باعث ہے کہ یہ نطق کے دریا میں جہاں لسانی شکار ہے اور زبان کی کشتیاں علیحدہ علیحدہ چلتی ہیں ایک پاؤں ایک کشتی پر اور دوسرا دوسری کشتی پر رکھ کر وہ ہچکولے کھاتے اور ڈولتے چلتے ہیں نہ اپنی زبان پر قادر ہیں نہ دوسروں کی زبان پر عبور۔ رفتہ رفتہ یہی عمل فطرتِ ثانیہ بن جاتا ہے اور افسوس کہ یہ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ یہ مرض متعدی ہے۔

تعلیم و تربیت کے اراکین اقتدار تعلیمی نظم و نسق کی درستی کو ملک کی اصلاح بیان کرتے ہیں اور اس موضوع پر رات دن دھواں دھار تقریروں کے ہنگامے برپا ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ معاشی توازن کے بغیر تو تعلیم نیم مردہ ہے وہ تو اتنا بھی نہیں سوچتے یا شاید دانستہ اس رُخ کو سامنے نہیں لاتے کہ تعلیم کے مصارف پر تو بجٹ کا دسواں حصّہ بھی صرف نہیں ہوتا۔ وہ تو اپنے سفر خرچ اور دیگر لوازمات نادوا کو بھی تعلیم کے مصارف میں شمار کرتے ہیں ان کی اس پر کبھی نظر نہیں جاتی کہ وزیر اور چپراسی کی تنخواہ میں ہزار گنا کا بل ہے۔ حالانکہ فطری طریقہ یہ ہے کہ ہر انسان کو اس کی ضرورت کے مطابق ملتا ہے تاکہ منشاءِ ربوبیت عدل و استحسان کی راہ سے پورا ہوتا ہے۔

# اوچھی تجارت

تجربہ میں آیا ہے کہ اوچھا تاجر کوئی مخصوص کلچر اور کوئی ذاتی تہذیب نہیں رکھتا وہ دوسروں کی چربی سے چراغ جلا کر اپنی زندگی کی دھندلی تحریروں کو روشن بناتا ہے اس کی فطرت میں محنت اور عرق ریزی نہیں ہوتی وہ بزدل ہوتا ہے اور عیار!

کامیاب تاجر مذہبی پایا جاتا ہے اور رحم دل بھی مگر یہ لوگ اخلاق کے روشن گوشوں سے شاید مصروفیت کے باعث آشنا نہیں ہو سکتے یا پھر چلتی پھرتی دولت کے دامن کی مہا روحوں کو بیمار کر دیتی ہے۔

تجارت کے بلند مقام پر پہنچ کر ہندو متعصب ہو جاتا ہے مسلمان۔

غافل، انگریز شاطر اور جرمن مفکر و جنگجو۔

اوچھے تاجروں کے یہاں جھوٹ کو زندگی کی دوسری ضروریات کی طرح ضروری اور لازم خیال کیا جاتا ہے وہ عشق اور مذہب میں بھی اپنی اسی فطرت سے کام لیتا ہے بعض بعض مقامات پر تو حسین چہروں اور عبادتوں کو بھی آڑھت پر دیکھا گیا ہے۔

اوچھے تاجر کے دوست بدنصیب، دشمن خوش بخت اور عزیز و اقارب خطرے میں ہوتے ہیں۔

اوچھی تجارت کے کارکنوں کو جب بھی چھان پھٹک کر دیکھا گیا تو ان کی تہ میں اخلاقی پستی ملی، ان کی مکروہ فطرتوں پر کہیں تو کنیت کے جعلی پردے پائے گئے کہیں تجارتی اداروں کے امتیازی گدپوش کہیں خطابات کی جھالریں اور کہیں امتیازات کے مصنوعی القاب ایسے لوگ نہ ہمدرد ہوتے ہیں نہ منصف، ان کے علم کی حقیقتیں اور ہنر کی نقابیں حریری اور کمزور ہوتی ہیں۔

اس قسم کے تاجر ذہین ضرور ہوتے ہیں مگر ان کے ضمیر اعلےٰ مقاصد سے ہاتھ نہیں ملاتے وہ ہمیشہ نفاق کی بنیادیں اُٹھاتے ہیں اور اس پر خود غرضیوں کے کھوکھلے محل تعمیر کرتے ہیں۔ ان میں ترقی یافتہ لوگ ایجادات بھی کرلیتے ہیں مگر اس کاوش میں ان کی

تاجرانہ ذہنیت کام کرتی ہے۔ مخلوق کا مفاد پیش نظر نہیں ہوتا نہ کوئی پاک جذبہ!

اوچھا تاجر دوستی کا ہاتھ اس وقت بڑھاتا ہے جب اسے یا تو مالی منافع کی اُمید ہو خواہ دوست سے یا اس کے ذریعہ سے، یا پھر کسی قسم کا نزدیکی یا بعیدی خطرہ ہو!

ایسے تاجر آڑے وقت میں دوستوں کی خودداری، عزت رسُوخ اور موقع لگے تو جان بھی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ اور جب اس موقع کے کنارے بھی وقت کے ہاتھ سے نکل چکتے ہیں تو یہ اپنی خودغرضیوں کو ذرا اُجال کر علیحدگی اختیار کر لیتے ہیں تاکہ جاں نثاری اور وفا کی قیمت نہ ادا کرنی پڑے!۔

اوچھے تاجروں میں بُرے ہونے کی صلاحیتیں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔ وہ دوسری زبان بھی اختیار کر لیتے ہیں مگر اس قربت اور انہماک سے فطرت نہیں بدلتی وہ شیطان کی طرح سوچتے ہیں اور مخبروں کی طرح دوستی کرتے ہیں۔

یہ لوگ بعض اوقات خوشامد اور چاپلوسی سے نزدیکی حاصل کرتے ہیں بعض وقت تکلف سے، اور بعض اوقات رشوت سے جس کی فہرست میں وقار بھی ہوتا ہے۔

اوچھا تاجر دوستوں کو اپنے مفاد میں کھاد کی جگہ استعمال کرتا ہے۔
تاکہ فصل اچھی اور قیمتی ہو۔ ورنہ کھیت میں بکھیر دینے کے بعد کھاد سے کوئی
واسطہ یا ہمدردی نہیں رہتی۔ اس کے پسینہ سے ایک قسم کے ناپاک مواد
اور بے ایمان تحکم کی بُو آتی ہے۔ یہ مزدوروں اور کسانوں کا بدترین
دشمن ہے اسکی ہر پالیسی دوغلی اور ہر ہمدردی ناقابل اعتبار ہوتی ہے
کسی اوچھے تاجر سے بات کرتے وقت اس کی چکنی چپڑی ظاہرداری
کے باوصف اس کی گودن اور کندھے کی مثلث میں اس کے بدصورت
نفس زادے آنکھیں مٹکاتے نظر آتے ہیں. جو زندگی کے بازار میں
صلاحیتوں کی پونجی عمل کے کاروبار میں لگاکر منافع اور گھاٹے کے
سودوں کی پڑتال نہیں کرتے۔ وہ بھی بڑی قسم کی تجارت اور اوچھا پن ہے
کاشتکار اپنے کھیت میں بیج۔ پانی اور کھاد وغیرہ کی فراوانی کے
نا سمجھ اگر فصل کے وقت اور کشائی کے موقع سے غافل رہے اور
دوسروں پہ اعتبار کرے تو وہ بھی اپنے پیش ہیں ساتھیوں میں اوچھا
ہے۔ اوچھی زندگی اوچھی تجارت کی طرح سطحی اور وقتی حوالوں پر مطمئن
رہتی ہے۔ جس میں نہ کوئی ثبات ہے نہ ہمہ گیری ایسی زندگی میں اصل
پونجی کا بھی تحفظ نہیں ہوتا اور جس بیوپار میں اصل بھی خطرے میں ہو
اُس کے نفع کی نوعیت اعتباری ہے اور بس۔

# جھوٹ

جھوٹ سب سے بڑی بدنصیبی ہے!

جھوٹ کی ہواؤں سے زندگی کی صداقت کے پتّے زرد ہو جاتے ہیں اور اعتبار و اعتماد کی شاخیں ٹوٹ پڑتی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ رفتہ رفتہ اطمینان کی جڑوں سے کونپلوں کے لئے رسل و رسائل کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے اور زمین اپنی روحانی رسدگاہ سے نام خارج کر دیتی ہے۔

جھوٹ ایک چکنا مگر مزدار گوشت ہے اسے انہیں لوگوں کا معدہ قبول کرتا ہے۔ جن میں تیزابیت زیادہ ہوتی ہے اور حرام ان کے جبڑوں میں نہیں بولتا۔

عموماً جھوٹے آدمی سے گفتگو کرتے وقت روح دل کا ساتھ چھوڑ

دیتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُس آدمی میں انسانی آواز کے علاوہ ہر چیز کسی حرام جانور کی ہے۔ جسے جھوٹ بول کر افسوس نہیں ہوتا، وہ کچھ دنوں کے بعد ذلیل ہو کر رہتا ہے۔ اس کا ایمان بے قیمت اور روح مجرم ہوتی ہے۔ اس کے دوست بیوقوف اور اسکے مخالف حق پہ ہوتے ہیں۔

جھوٹا انسان سستی مسرتوں اور معمولی مقاصد کے لئے دوستوں کے اعتماد کو ٹھکرا دیتا ہے اس کی روح بھک منگی اور بدن کرایہ کی چیز ہوتا ہے۔ اس کے قول و فعل کی قیمت اس بازاری دوا فروش سے زیادہ نہیں ہوتی۔ جو سڑک پہ مجمع لگا کر غیر معتبر دواؤں کے اعلیٰ خواص کا دعویٰ کرتا ہے۔

جھوٹا انسان بُرے وقت کا ساتھی نہیں ہوتا وہ تو ہر یا گائے کی طرح شاداب خطے ڈھونڈھتا ہے۔ وہ اپنی اس کمینگی کو صلاحیت خیال کرتا ہے دوستوں کے نقصان پر اُس کی نظر نہیں ہوتی۔

جھوٹے شریف سے وہ بدمعاش بہتر ہے جو تھانے اور عدالت کے سوا کہیں جھوٹ نہیں بولتا۔

جھوٹا انسان دوستوں کا تو کیا ذکر ماں باپ کی عزت اور آبرو کا بھی خیال نہیں کرتا اس کی عمر تو بے غیرتی کی راہوں اور معائب کے

شکنجوں میں گذرتی ہے۔

جھوٹا انسان ظاہری طور پر چالاک مگر باطنی طور پر نہایت احمق ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں موجودہ تمدن کے جھوٹے اداروں میں اس کی گنجائش نکل سکتی ہے لیکن فطرت اُسے ضمیر جیسی دولت سے محروم کر دیتی ہے۔

جھوٹ میں سب سے جھجک انسان دُنیا کے کسی عیب کو عیب نہیں سمجھتا اور اس میں نہ ہمدردی ہوتی ہے نہ وفاداری نہ ایثار اور نہ اپنی حفاظت!

جھوٹ کی پرداخت الجھنوں کا ایسا سلسلہ ہوتا ہے جس کا اختتام نہیں ہوتا۔ کیونکہ ایک جھوٹ کو نباہنے اور سچ کا قائم مقام بنانے کے لئے بے شمار دروغ بافیوں کے حصار اور ناکے لگانے پڑتے ہیں۔ اور یہ عمل ایک ہلاکت ہے بوکھلائی ہوئی اور رفتار سے گھبرایا ہوا۔

سچ کے بنیادی معنی ہیں "امرِ واقعہ" یا "حق" فطرت اپنی طہارت و سادگی میں صرف حقیقت ہے اور اپنے سوتی ظہور میں بے تکلف اس بے تکلفی کے علاوہ واقعاتی نوعیت کو روکنا یا اُلٹا پھیرنا ایک گستاخی ہے فطرت کے حضور میں اور بغاوت ہے فطری تقاضوں سے اور اس پر مسلسل اصرار سے انسانی عظمت کچلی جاتی ہے۔

# کسان

اگر تو نے اپنی انسانی خوشبو زائل نہیں کردی تو کوئی گناہ تجھے ناپاک نہیں کرسکتا۔ گندی سے گندی نالی سمندر کے سینے کا دودھ پی کر پاک اور جاوید ہو جاتی ہے۔

کیا تو یہ نہیں جانتا کہ سورج بھی تیرے سمندر کا نمک خوار ہے مگر تو اپنے انگاروں اور دہکتے ہوئے شعلوں سے واقف ہو تو جانے۔

تو نے تو اکتفک کے جوتوں میں سیسہ کے نعل جڑوا لئے ہیں۔ تیری قوتِ پرواز بہانہ جو اور کام چور ہو گئی۔ دیکھ انسان تیرے ذخیرے سے اپنا مقصد حیات اٹھائے لئے جا رہے ہیں۔ جن کے پاس انسانی ہمدردی کے لئے الفاظ تک نہیں۔ جعلی دوستی اور ملمع کا اخلاق

رکھنے والا کون جانتا ہے کہ تیری بھوک کی آگ تیرے ہی خون سے بجھتی ہے اور تیری پیاس کی خشکی تیرے ہی پسینے سے سیراب ہوتی ہے۔

تجھے ابھی اس پر یقین نہیں کہ تجھے اپنی کاشت کا انہماک ہی مصیبتوں سے نجات دلا سکتا ہے کیونکہ فلاح و بہبود کا راستہ ابھی انہیں فیصلوں میں ہے جو ماہ و سال کے حمل میں ہیں اور شاید تو ابھی اپنی کاشت کے معنی اور اہمیت سے آگاہ نہیں۔

یہ احساس کس قدر تکلیف دہ ہے کہ کسان کی زندگی ایسا غم ہے جس کا سبب اُسے معلوم نہیں جس سے برکتوں کا مرکز اس کی نظر سے اوجھل ہے۔

یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ کسان کی زندگی زنگ آلود ہو کر نمبرداری کی طرف رُخ کرتی ہے تاکہ بے ایمانی میں ناقص حکومت کی تقلید کر سکے۔

○

# جزویت از پیغمبری......

صحیح شاعر متعصب نہیں ہوتا اس کے دل میں محبت ہی محبت ہوتی ہے وہ مایوسیوں کے باوصف اور فریب خوردگی کے باوجود محبت سے دست بردار نہیں ہوتا اُسے انسانیت سے بڑی امیدیں ہوتی ہیں وہ مجرموں اور گنہگاروں دونوں کو رحم کے قابل سمجھتا ہے۔

اونچے رئیسوں کا قصیدہ خواں اور کام چور جاگیرداروں کے جھوٹے پیالوں پر نظر رکھنے والا شاعر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ شاعر کا علم بھکاری اور صلاحیتیں گداگر نہیں ہوا کرتیں وہ تو خدا کے سوا ہر متکبر کو پستی میں محسوس کرتا ہے۔

شاعر کے لیے شبنم کا ایک قطرہ ہزاروں زلزلوں اور لاکھوں طوفانوں

کا حامل ہوتا ہے وہ افلاس کو دولت کا لقب دیتا ہے اور سرمایہ داری کے اُن تمام گوشوں سے آشنا ہوتا ہے جن پر سورج کی روشنی نہیں پڑتی وہ تو ایک ترجمان ہے حقیقت کی آرزوؤں اور فطرت کے مطالبات کا :

وہ شاعر ہرگز نہیں جو دوسروں کے اُگلے ہوئے لقموں کو رنگ کر یا طلائی اور نقرئی ورق لگا کر اپنے دسترخوان پر سجا لے شاعر تو قوموں کا نباض اور انسانیت کا طبیب ہوتا ہے اس کے دل میں غریبوں کی محبت کے ساتھ ساتھ مفاد پرستوں سے نفرت ہوتی ہے اور اپنی رہبری خود کرتا ہے۔

صحیح شاعر وہی ہوسکتا ہے جس کا دماغ خونی مشوروں اور دل دردمندیوں سے بٹا پڑا ہو۔ جس کے کان وقت کے منصوبے سُن سکیں اور ناک انقلابی ہوا کو سونگھ سکے۔ جس کی بجلی زمین تک نہ پہنچ سکے بلکہ کائنات کے دلوں پر کوندتی پھرے۔

شاعر کی صحیح عبادت بھی اس کی شاعری ہے اور صحیح گناہ بھی اس کا شعر ہی اس کی اولاد ہے اور وہی دشمن۔

شاعر فطرت سے محبت کرتا ہے اس لئے اس کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے۔ اور جب تک یہ وصف نہیں شاعر نہیں کہلایا جا سکتا۔ مایوسیاں اس کی مشعل اور آلام اس کے نمزا بی ہوتے ہیں وہ ایسی راہ پہ منزل پر

گامزن ہوتا ہے جس میں زمانوں کا رواج نہیں ازل اس کی ڈیوڑھی ہے اور ابد خواب گاہ۔ زندگی اس کے مکان کے صحن سے زیادہ وسیع نہیں۔

اُس کی نگاہوں میں ماضی کے آثار، حال کے مشاہدے اور مستقبل کے نظریئے بسیرا لیتے ہیں۔ وہ اپنے نگار خانے میں حال کے تدھم نملو طاور دھندلے خاکوں کے پس منظر سے مستقبل کی رنگین اور روشن تصویریں بناتا ہے۔ اس کی زندگی میں محبت بھی ہے اور تنقید بھی۔ وہ تنقید میں محاسن کو اس طرح اُجاگر کرتا ہے کہ معائب کا خلا نظر آنے لگے۔ اکتسابی کلیوں ہاتھوں سے ٹٹول کے چلنے والے نقاد اپنے احاطہ کی قد آدم دیواروں تک ہی تنقید اور رائے زنی کر سکتے ہیں اور بس لیکن شاعر کا مقام اس سے آگے رہے۔

زندگی اس کا ایک وجدانی تجربہ اور رومانی تجزیہ ہے اس کی زندگی اپنا مقصد خود ہے۔ وہ باہر کے مقاصد میں نہیں الجھتی۔ اس کے تراشے ہوئے بھیانے اور ڈھالے ہوئے آلات نظام تمدن کے خصوصی آلے قرار پاتے ہیں۔

اس کا مشرب شمشیر بند نہیں، بلکہ آلہ اصلاح رکھتا ہے۔ وہ تصادم حیات سے پہلے فضاؤں میں آنے والے حادثات کی آہٹ سن لیتا ہے۔ کیونکہ پیدائشی طور پر وہ فطرت کا جریب کش اور حیاتِ انسانی کی گھاٹیوں کا ذمہ دار شحنہ ہے۔

شاعر کے ہیولے میں تغیر نمو اور ارتقا خاموشی سے نہیں گذرتے بلکہ پکار کر اور جبلت کی زنجیر کھول کر آتے جاتے ہیں۔

مشکلات کی آندھیاں اس کے چراغ کی لو کو لرزا تو دیتی ہیں مگر گل نہیں کر سکتیں۔ وہ اپنے دریچوں سے بگولوں پر ہنستا اور ویرانیوں پہ قہقہے لگاتا ہے۔

شاعر وقت کا جنا سہی مگر یہ اپنے گردوپیش کی از سر نو پڑتال کر کے تعمیری ہو کر اس مرتب کرتا ہے۔

جب شاعر کی بانسری میں حال اور مستقبل کی آوازیں مل جاتی ہیں تو اس کے پیغام میں بشارت ہی بشارت ہوتی ہے۔ شاعر میں جب یہ داخلیت دروازہ کھولتی ہے تو تنہائیاں اس کی ہمدرد ہو جاتی ہیں اور یہ اپنی زنجیروں سے باتیں کر کے خوش ہوتا ہے

اس کی تنہائی ایسے نغمے بکھیرتی ہے جس میں اجتماعیت اور انفرادیت ایک مزاج اور شعلہ و شبنم ایک جان ہو جاتیں۔

اس کا قلم چٹانوں کی پیشانیوں، ستاروں کی نبضوں اور سمندر کے جنگاسوں پر نشتر زنی کرتا ہے۔

شاعر ذوق حسن اور ذوق عمل دونوں کے ڈانڈے ملا دیتا ہے۔ اور پھر اپنے منادسے آسودگی کا اعلان اُس کی آخری آواز ہوتی ہے۔

شاعر زندگی میں راستے کے پتھروں سے بچ کر چلنے اور نشیب و فراز سے کترانے کے باوصف انسانوں سے ٹھوکر کھا کر منہ کے بل گرتا ہے اور گرتا رہتا ہے۔

وہ عالم انسانیت کے لیے مفید نہیں جو حکیم نہ ہو۔ نہ وہ حکیم جو عالم نہ ہو۔ شاعر ان دونوں مقاموں سے متعارف ہو کر فطرت سے پیغمبری کی دہلیز تک پہنچنے کا اجازت نامہ حاصل کر لیتا ہے۔

شاعر کا قلم سانپ کے زہر سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے اگرچہ یہ حقائق کے خلاف نہیں ہوتا اور نہ اس کی مخالفت اس قدر عام۔

شاعر کے اندا کی عمر زمانہ کے تعین سے آزاد ہے جن کی بنیادوں پر تاریخی ستونوں کا بار رہتا ہے۔

شاعر کے لئے یہ عظمت کم نہیں کہ وہ شاعر ہے سجادہ نشین نہیں اس کے اندر اکتسابی علم نہیں کھنکتا بلکہ فطری صلاحیتیں بنکارتی ہیں اس کی عقل مؤدب ہے اور لب بیباک!۔

اس کی نشست اور انسانی معراج کی چھتوں میں درمیانی منڈیریں نہیں جو خط امتیازی ہیں ملکیت اور حد و بندی کے۔

شاعر کو خریدنے کے لئے دولت کی نہیں حسن کی ضرورت ہے۔ حسن والوں کے متعلق صرف شاعر ہی جانتا ہے کہ ان میں انسان کا کس قدر فقط

اور وفا کتنی کمیاب ہے۔ اور شاعر کے متعلق صرف حسن ہی سمجھ سکتا ہے کہ یہ کس قدر خود غرض اور آوارہ مزاج ہوتا ہے لیکن کہیں کہیں امتزاج بھی دیکھا گیا ہے جس کی عمر معلوم نہیں ہو سکی!

تعجب نہیں کہ قحط بنگال میں لوگوں نے اپنی اولاد روٹی کے لئے فروخت کر دی ہو۔ جبکہ بھوکا شاعر اپنے اشعار آڑھت پر ڈالتا ہے۔ اور بے انصاف لوگ اُسے روٹی کے بدلے داد و تحسین دے کر چل دیتے ہیں، جس سے اُسے قدرے سکون تو مل جاتا ہے لیکن پیٹ نہیں بھرتا۔

حقیقی شاعر وہ ہے جو محلات اور جھونپڑیوں کا طول و عرض جانتے ہوئے جھونپڑی پسند کرتا ہے۔ اس کا قلم اپنی رفتار نہیں بیچتا جو تاریخ کی داغ بیل لگاتی ہے۔ وہ تو طوفانوں کے مزاج اور تباہیوں کی تقدیروں کا منجم ہے۔ راحت اور کرب کی کوئی کیفیت اس کی طرف کے کناروں سے باہر نہیں چھلکتی اور وہ جذبات و احساسات کی پرچھائیوں کو شعر بناتا چلتا ہے۔

آج کے ادیب اور شاعر سے ناشکرا ہونے کی شکایت تو کر، خود پسندی کے علاوہ وہ تمدن کی کسی مشین کے پرزے نہیں۔ انہیں داد و تحسین کے چٹورپن نے کام چور اور احسان فراموش بنا دیا ہے۔ یہ امداد کو اپنا حق سمجھتے ہیں اور تواضع کو بلند مقام نہیں دیتے۔

حالانکہ شاعر ہو یا مصوّر، فلسفی ہو یا سیّاس اس میں نظریات کی اُپچ کے ساتھ ساتھ انسانیت، بہادری، حلم اور دستور سازی کا مادّہ بدرجۂ اتم ہونا چاہئے جو اِن میں مفقود ہے اور یہ اپنی موضوعہ تعریف کے خانے میں نہیں آتے کیونکہ ان کے ذوق کے گھوڑے اچھے نہیں اور اسی خامی سے ان کے خیالات، نقوش اور تحریکیں زرخیز نہیں ہوتیں۔ ورنہ گھوڑے اچھے خیالات اچھی اولاد جنتے ہیں۔

ان کا مذہبی رُخ نیچا اور تفریحی پچھواڑا اونچا ہے یہ خود کو مذہب سے آزاد بتاتے ہیں اور اتنا بھی نہیں جانتے کہ مذہب کے دائرے سے کوئی شخص بھی باہر نہیں جا سکتا کیونکہ کائنات کے باہمی تعلقات کی آگاہی بھی مذہب کی تعریف میں آتی ہے۔

اس لئے جس کو جتنی دسترس "کائنات کے باہمی تعلقات" کی آگاہی میں ہے، وہ اُسی قدر مذہبی انسان ہے،

ہر مذہبی آدمی کی نظر ان تمام زنجیروں پر ہوتی ہے، جو ذرّے سے آفتاب کا اور ایک سرسراتے ہوئے دُوب کے ریشے سے باغ کا تعلق قائم رکھتی ہیں۔

آج کا شاعر کم اور ادیب زیادہ یہ خیال کرتا ہے کہ مذہبی لوگ کم حوصلہ پست دماغ، بے ذوق اور خوش عقیدہ ہوتے ہیں اور یہ آئینہ ہے

اُس کے علاوہ علم اور بودے دماغ کا۔ وہ اپنے ماحول کے بیمار شعر و ادب سے ہٹ کر کبھی زندگی کے طول و عرض اور غایت و مقصد کی طرف نظر نہیں اُٹھاتا بلکہ اپنے گناہوں کو آزاد اور نیت کو آوارہ بنا لیتا ہے۔

جب خیالات کے غیر مربوط اور زبان کو مسخ کرنا ہی ادب کا اصوُل ہو جائے تو شعر و ادب اپنے مقام پر نہیں بلکہ کم سوادوں میں دکھائی دینے لگتا ہے۔ ایسا ادب اُمتوں کی تقدیریں بدلنے میں ناکام رہتا ہے اور فضاؤں گرد آلودہ کرنے میں کامیاب۔

ناقص ادب کے اثرات سے عوام کی بلند حوصلگی۔ بالغ نظری اور ہمّتواری مفقود ہو جاتی ہے۔

جب شاعر شعر کے ذریعے فصاحت و بلاغت کے بلند معیاروں سے صدائے کائنات اور آوازۂ حق کا ہم آہنگ ہو جاتا ہے، تو اُس کی تاثیرات ارتعاشاتِ اعصابی تک ہی نہیں، بلکہ زمین کی نشوونما اور موسم کے تغیّر و تبدّل میں بھی کارفرما نظر آتی ہیں۔

○

# عوام

کچھ کانوں کے جنگل ہیں اور کچھ آنکھوں کے کھیت، نہ کان دیکھتے ہیں نہ آنکھیں سنتی ہیں۔ کاش ان کی آنکھیں اور کان منجمد ہو جائیں یا کر دئے جائیں۔

ان کی سماعت بھکاری ہے۔ ان کے کان کاسے ہیں گدائی کے۔ ان کی جھولی میں پھول بھر کے آنکھوں کو متوجہ کرو اور اپنی بلندی سے ان کے دماغوں کو آواز دے!۔ ان کے دل میں ابھی زرخیز مٹی موجود ہے جو ذرا سی دیر میں آنسوؤں سے نم ہو جاتی ہے۔ اس میں وہ پودے لگا جن کے بیج تو نے جبریل سے مانگے تھے۔

ان کی زمینوں کو اس جھنکاڑ نے گھیرا ہوا ہے جس سے آدم کا دامن

الجھا تھا۔

ان میں ایک دماغی طاعون پھیلا ہوا ہے۔ اور برابر عقیدوں کی میتیں نکل رہی ہیں۔

انہوں نے زمین پکڑ رکھی ہے یہ بلند ہونا نہیں چاہتے بلکہ مٹی چھان کر مرنا پسند کرتے ہیں۔ ان کے ہاتھ سے ان کی گودڑی کا ایک سرا نکل چکا ہے۔

انہیں آسمانوں سے سروکار کہاں یہ تو ستاروں کی دنیا سے ڈرتے ہیں یہ بھول چکے ہیں کہ ثوابت وسیار ان کے بچپن کے اڑائے ہوئے غبارے ہیں۔

یہ مٹی کے کھلونے بنا کر خوش ہوتے ہیں۔ اب ان کے چاک پر دل نہیں اترتے بلکہ آنکھیں چکراتی ہیں۔

یہ سر سے پاؤں کی جانب ترقی کرنے کے باعث وداسانہ کو طبیب سے بہتر سمجھتے ہیں۔ روحانی قمقموں کا اس مادی آبادی پر کہیں چاندنا نہیں یہ تو زمین ہی کو جنت بنانا چاہتے ہیں اور ان کی یہ خامی پختہ ہو چکی ہے۔

ان کے اخلاق اور سیرتوں کے کنارے جھڑ گئے اور روحانی نغمے ان کی وہ کوریں درست نہیں کر سکتے۔

ان میں کچھ ابن الوقت خود کو ابوالوقت کہتے ہیں اور اپنے ایجاد کردہ

ہتھیاروں پر نازاں ہیں۔ ان کا کام ہے کہ اپنی فطرت کے زہر کو دوسروں کی شریانوں میں داخل کرتے رہیں۔

یہ شبنم سے بجلی مانگتے ہیں بادلوں سے نہیں۔ ان کے دلوں کی آبادی میں غلامی اور بزدلی کی برف پڑتی ہے۔ ان کے منصوبوں میں نہ اتفاق حائل ہے نہ آسمان۔

اس کٹھیڑے ہجوم میں آئے دن نا اہلوں کو لیڈری کے دورے پڑتے ہیں۔ اور جہلا کو فضیلت کے خطابات کی تشنگی لئے پھرتی ہے!

یہ ایک گلہ ہے جو سرگوشیوں پر زندہ ہے اور ہر چیز کا ذائقہ ناک سے معلوم کرتا ہے۔ ان کی آنکھوں میں شعور نہیں انہیں مطلق خبر نہیں کہ ہر روز انہیں میں سے مذبح میں جاتے ہیں کیونکہ ان میں تو نہ ماضی ہے نہ مستقبل بلکہ حال نے حجریں چھوڑی ہیں۔

یہ زمردین کھیتوں اور زعفران زاروں کو اپنی خوراک بنانے کی کوشش میں ہیں۔

ان میں کئی خاندان تو ایسے ہیں، جن کا ہاضمہ درست ہے۔ حالانکہ دھات چرنے سے خون خراب ہو جاتا ہے۔ وہ شاید تریاق سے آگاہ ہیں۔

ان میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو مدقوق ٹڈیوں، مسلول بوٹیوں،

اور سبز سبز چیزوں کو بھی چوس لیتا ہے اور اسے گھن نہیں آتی کیونکہ ان کی آنکھوں میں چربی زیادہ ہو گئی ہے یہ کانوں پر سائنس کی عینک لگائے پھرتے ہیں۔

ان کی سبزہ گاہیں کھلے اور فراخ دل میدان نہیں بلکہ مصنوعی سبزہ زاروں کے کام چوراہا، پلاٹ اور شراب کی بو سے بھرے ہوئے سفید پوش ہوٹل ہیں۔ ان کے ذہن حقائق سے منکر ہو چکے ہیں۔

یہ گروہ عموماً اس مغرور اور متکبر طبقہ سے مشتق ہوتا ہے، جو پست ہوتے ہوئے خود کو بلند معیار اور خوش نصیب خیال کرتا ہے اور ظاہری نمود و نمائش کو ہر کمیت کا بدل اور خرابی کا مصلح سمجھتا ہے۔

منطقی طور پر اسے یوں سمجھئے کہ عامیت روح انسانی کی ایک حالت ہے جو کسی لحاظ کے بغیر زندگی کی آنکھوں پر سرخ آئینوں کی عینک کا کام دیتی ہے۔ اور اس کی گرمی رنگ کو صحیح تربیت کے سوا کوئی چیز فنا نہیں کر سکتی۔ لیکن اگر صحیح تربیت نہ ہو تو اس سے زندگی کی آنکھیں بھی آجاتی ہیں اور صحت نصیب نہیں ہوتا۔

# انجام؟

جہاں ذلت نصابِ حیات میں داخل ہو اور پیسے دینی کی موت، پر پس ماندگان خوشیاں منائیں ــــ جو اپنے سے بلند ہر طاقت کو معبود سمجھیں ــــــ جو کہ کہیں تو تلوار کی پرستش کریں ــــ اور کہیں دولت کی۔ کہیں گروہ کی اور کہیں ڈاکوؤں کی۔ جنھیں اپنے بھائیوں کا لہو پی کر سرور ملے ــــ اور جن کی رگوں میں دھاری دار لہو گردش کرے ــ جن کے چہروں پر ان کی ذہنی خرابیاں ثبت ہوں! ــــــ وقت اور تاریخ نے جنھیں انسانیت کے دروازوں سے ہٹا دیا ہو۔

جہاں لوگ ہمسایوں کے ناموس پر دانت پیستے اور اپنے محلے

کی ہو بیٹیوں کو اپنی ہوس کا شکار بنانا چاہتے ہوں جو اندھی مصیبتوں میں جاگتی ہوئی خود غرضیوں کی انگلی پکڑ کر چلیں ہیں۔

وہ تمام لوگ، جو ابنائے وقت اور جاہ پرستوں کو لیڈر اور معبدوں کی تنگ فضا میں سانس لینے والے زہر فروشوں کو رہنما تسلیم کریں۔ جنھیں یہ معلوم نہ ہو کہ غریبوں کے خون سے سونے کے ذرات نکالتے اور کسانوں کی ہڈیوں سے چونا بنا کر ایوانوں میں سفیدی کرنے والے لوگ مقدس روحوں کی اطاعت نہیں کرتے۔ وہ تو شقاوت میں جابک دست اور ضمیر فروشی میں طاق ہوتے ہیں۔ جن کے بشروں پر ماضی کی ہیبت اپنے آہنی کھروں کے نشان چھوڑ گئی ہے۔

جہاں وہ کج اندیش لوگ بھی ہوں جو اپنے ضمیر کی عظمت اور نفس کی تقدیس سے منہ پھیر کر جابر امیروں اور بے انصاف حاکموں کے آلۂ کار بن جائیں تاکہ ان کے گناہوں کے سائے سمٹتے رہیں۔ جنھیں یہ معلوم نہ ہو کہ ان کی پرچھائیوں سے دھواں اٹھ رہا ہے اور عنقریب یہ بھڑک اٹھیں گی جن سے ان کے جسم محفوظ نہیں رہ سکتے۔ وقت کے دوزخ کی لپٹیں مستقبل قریب کے کسی گوشہ سے ان پر نظریں جمائے ہوئے ہیں۔ جنھیں خبر نہ ہو کہ سب جان گئے ہیں

کہ منصبی بلندیوں پر جانے والے نااہل لوگ کمزوروں کے جسموں کی پاٹ باندھتے ہیں، اور طاقت اپنے اعلان کے وقت غریبوں اور مسکینوں کی زبان میں گفتگو کرتی ہے۔

جہاں جنگ کی بھٹیوں کا ایندھن بکثرت آگتا اور بک جاتا ہو

جہاں قوم فروش خاوندوں پر عورتیں فخر کریں اور ان سے اولاد لیں جن کی ذاتی ان کی زندگی کے کانوں سے موت کی روئی نہ نکالے —— جو زندگی کے نغموں سے بدکتے اور گلوں میں بیٹھے بندھوا کر بھونکنے کے عادی ہو چکے ہوں۔

جہاں لوگ بگڈنڈیوں میں پیدا ہو کر میدان میں مرجاتے ہوں اور شروع ہی سے ان کی تربیت کے لئے شیطان مقرر ہو جائیں جن کی ترقی کے دو ہی مرکز ہوں جیل یا ریل!

جہاں لوگوں کے ہاتھ پاؤں سے غلامی کی بیڑیوں کے نشان مٹنے میں نہ آتے ہوں! اور اُنکے کرداری نشیب گہرے ہوتے چلے جائیں

جہاں علم تعصب سکھاتا ہو —اور ہم جنسوں کے سینوں پر حسد کے پوسٹر چسپاں کرنا بہترین مشغلہ قرار دیا جائے۔

جہاں استاد شاگردوں کے کاندھوں پر سوار ہو کر دنیا سے اپنی شہرت کا حصہ مانگیں، حالانکہ دنیا اچھی طرح جانتی ہے کہ گاڑی کو کھینچ

نہیں کھینچتا بلکہ بیل کھینچتے ہیں۔ کُتّا تو دھوپ سے گھبرا کر سائے میں چلتا ہے۔

جہاں کے لوگ اپنے رُوحانی دریاؤں کو کھرے میں تبدیل کر چکے ہوں۔ اور اس میں بجلی کی چمک دیکھ کر اپنی خوش بختی کے منتظر ہیں کیونکہ ان کے عقیدے کوڑھی ہیں اور ان کا علم تربیت یافتہ نہیں۔
جہاں لوگ زندگی کی نچلی منزل میں قید ہو کر اس کی بالائی منزل کے اندا فوں پر لڑتے جھگڑتے ہیں اور جب یہ بحث کریں تو ان کے ایمان کی ہڈیاں کھڑکھڑائیں۔

جہاں قدیم باشندے اپنی آنے والی نسلوں کی پھانسیوں کے لئے پناہ گزینوں کے زرد پیٹھوں سے تانت بنا رہے ہوں۔ اور انسانی ہمدردی قبول نہ کریں۔
اگرچہ یہاں نئی سرمایہ داری کی جڑیں مدتوں روشنی میں رہیں گی مگر اُن کی امیدوں کے درختوں میں زرد پتوں کے سوا کوئی پھل پھول نہیں آئے گا۔

جہاں عقاب خاک بسر ہوں اور گدھ آشیانوں پر قابض ہوں۔ حالانکہ بلند آشیانی ان کے بچوں کو راس نہیں آسکتی۔

# دوست پیشہ

اگر تو محسوس کرے اور اُس کے تکلف کے آنسو بازو بھی غور سے دیکھے تو اس کی باسلیقگی میں سے بھی اس کا اوچھا پن جھانکتا ہوا ملیگا۔

یہ ہمیشہ پرانے دوست کی قیمت اور خصوصیت فروخت کر کے نئے دوست خریدتے ہیں۔ اِن کے خلوص میں بیج نہیں ہوتے، بلکہ چھلکا ہی چھلکا۔

یہ اپنی پستیوں میں خدا، مذہب، عشق اور انصاف کو اپنے اغراض کا ایک جزو بنا لیتے ہیں۔

ان کی ریاکاری کی جھالر کو جب بھی اُلٹ کے دیکھا۔ تو کہیں ان کے ضمیر ڈکراتے ملے اور کہیں ان کے ایمان سند ھڑتے نظر آئے!

جب یہ عبادت گاہ میں جاتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ظاہرداری ان کے ایمانوں کو ڈنڈا ڈولی کر کے ہسپتال کی طرف لے جا رہی ہے۔

یہ سادہ خاطر دوستوں اور پیاسے راہگیروں کو اپنے شیریں زہر سے ہلاک کرنے کو اہلیت قرار دیتے ہیں۔ ان کی گربھ بانی سیکڑوں واجد حواریوں اور ساتھیوں کے جلو میں نکلتی ہے تاکہ پہچانی نہ جائے۔

ان کی گفتگو کے اُڑان اڈوں میں اپنی عظمتوں کے کھوکھلے محلات اور جھوٹے وعدوں کے بوُدے طیاروں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

کئی بار تو انہیں مقاصد اور خود غرضی کے بوجھ سے دبا ہوا اور ان کی بیویوں کی عصمتوں کو اجنبی باڑوں میں ممیاتے سنا گیا ہے یہ اپنے مقصدی مرکز سے نظر نہیں ہٹاتے۔ اُن کی مردار خوری شائستگی کا ایپرن پہنے ہوتے رہتے ہے جب ان کے کان اخلاق اور نیکی کے گھونٹ بھرتے ہیں تو ان کا منہ بگڑ جاتا ہے۔ اور اکثر سرِ مجلس اُچھو لگتے دیکھے گئے ہیں۔

ان کے معدے میں الٹی آنتیں لگی ہیں جن سے ہر پاک غذا ناپاک اور ہر صالح چیز متعفن ہو جاتی ہے۔

اگر ان کی شیطانی ذہانت دیکھنا ہے تو ان سے اپنے دشمنوں کے متعلق مشورہ لے ان کی زبان بُری خبروں کا ریڈیو اور ان کا دِل گناہوں کا ٹیلی پرنٹر ہے!

ان میں بعض اس نسل سے بھی تعلق رکھتے ہیں جو آستینوں میں رہتے اور انگلیوں سے کھیلتے کھیلتے زبان میں جھٹک دیتے ہیں۔

دوست بیشگی حصولِ مقصد کا وطیرۂ عمل ہرگز نہیں بلکہ بزدلانہ افکار ہیں۔ یہ پیچیدہ پگڈنڈیوں سے منزل پر اور چور گلیوں سے فطرت کے چور دروازوں تک پہنچنے کی ناکام کوشش ہے۔

سچی دوستی تو سراپا صداقت ہوتی ہے جس کے مشرب میں تکلفات ممنوع اور داؤں گھات حرام کا درجہ رکھتے ہیں۔

زندگی کے ٹھوس حقائق پر کھینچ تان کر فرضی اقدار کا غلاف چڑھانا فطری تقاضوں کے خلاف ہے۔ یہ تو وسیع سرابوں میں گم ہو جانے اور ظاہر داریوں میں زندگی کی روانی سے بیگانہ اور اعتباری احوال میں بسر کرتا ہے۔ جس میں دُکھوں کی رکھوالی اور مسرتوں کی دشمنی کے بغیر چارہ کار نہیں رہتا۔

# اے تازہ واردانِ بساط

تم نے اپنے مذہب کی ایڑیاں کاٹ دی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک قدم بھی نہیں سرک سکا۔ تم نے شیطانی مکتبوں میں آنکھیں کھولیں اور غلامیوں میں پرورش پا کر ریاکاریوں کی سند لیتے ہی لپاڈگی میں مصروف ہو گئے اور تمہاری بلندیاں تمہارا انتظار کر کے مایوس ہو گئیں۔

تمہارے ہونٹ تمہاری بزدلی نے سی دیئے اور تمہاری زبان پہ تمہارے ضمیر کے سنپولیے چپک گئے۔

تم نے موت کے دروازے پہ دستک دی۔ موت نے تمہارے گھناؤنے چہرے سے نفرت کی، کیونکہ تمہارے چہرے پہ اچھی اور پاک غذا کی شادابی نہیں تھی۔ تم تو حشرات الارض کے رشتہ داروں میں معلوم

ہونے لگے۔

تمہارے شعلے تم سے بات نہیں کرتے اور تمہارے افکار تم سے منہ چھپاتے ہیں۔ تمہاری امیدیں تم سے پردہ کرنے لگیں اگرچہ وہ تمہارے گھر پیدا ہوئی ہیں۔

جو آج تم میں نہیں اُن کی بیویوں کی آہیں، بچوں کی چیخیں اور ماؤں کے آنسو جنت کے پھول بن گئے۔ ان کی روحیں ایک نیا انقلاب لائینگی جس میں صداقت کے پرچم بلند ہونگے اور مجاہدوں کے سینوں پر حق و صداقت کے امتیازی نشان جگمگا اٹھیں گے۔ مگر تمہیں اس سے کیا؟

قدرت تمہیں اُن بھیڑیوں میں لے آئی جو قبرستان میں رہتے ہیں اور جنگل کے رہنے والے بھیڑیوں میں ذلیل ہیں۔

بعض مقامات کے جرائم تو ارکین حکومت کو بھی جرائم پیشہ بنا دیتے ہیں اور ان کے گناہ پیشواؤں کے دلوں پر بھی شبخون مارتے ہیں۔

اب تم وہاں آ گئے ہو جہاں مذہبی پیشواؤں کے دلوں اور دماغوں کے درمیانی فاصلہ کا نام بساطِ حکومت ہے۔ جہاں پیادے حکومت کو جھیلنے سے قاصر ہیں اور ہر طرف طاقت اور تجارت کی سڑکیں بچھی ہوئی ہیں۔ یہاں مفکر کم ہیں اور مکبر زیادہ!

یہاں نہ بچے مہذب ہوتے ہیں اور نہ بوڑھے فلسفی مگر ہر جوانی دیوانگی

سے ہمسفد ضرور حاصل کرتی ہے۔

تمہاری جماعتیں بے عمل اور تمہارے منصوبے بے انجام ہیں۔ تمہارے جلسوں میں مقرر مصنفین کے جھوٹے الفاظ کی جگالی کرتے ہیں جن کی زبان اور دل میں کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

تم ایسی فرقہ گاہ میں آگئے ہو جہاں آئے دن جماعتوں کا طلوع و غروب برپا رہتا ہے اور ذہانت ہنسی خوشی ریاکاری کے ہاتھ پر بیعت کر لیتی ہے جہاں پیروی اور وضعداری دستگیریاں ہیں۔

تم تعداد میں کم نہیں لیکن ایک زخمی اور احتجی جماعت کا مرہم پٹی کے سوا کیا مشغلہ ہو سکتا ہے۔ جب تم اپنے زخم سے پٹی کھول کر کسی کے زخم پر باندھ دیتے ہو۔ تو تمہارے زخم کا انگور کھل جاتا ہے اور لہو دینے لگتا ہے مگر تم میں یہ صلاحیت کہاں کہ غائت پر غور کر سکو۔

کیا اچھا ہو کہ تم اپنے ہمسایوں کے بودے سہارے چھوڑ کر اپنے سینوں میں اسی آگ کو روشن کر دو، جو چنگاری ہوتے ہوئے بھی بوڑھے آتش کدوں کو گلزار کر سکتی ہے۔

میں دیکھتا ہوں کہ تمہارے ایمان اور عقیدے بچوں کی کاغذی پھرکی کی طرح ہیں جو ہوا کے معمولی سے اشارے سے گھومتی رہتی ہے۔ برسات کی اانبی گھاس کی طرح تم وقت کے جبر سہہ رہے ہو مگر تمہاری

نظر اس پر نہیں کہ تناور درختوں سے آندھی جھک کر گذرتی ہے۔ اور بگولے رقص بھول جاتے ہیں۔

کاش تم ان سے بچ سکو جو حاکم کے سامنے غلام۔ طاقت کے سامنے گونگے، دولت کے سامنے ایمان فروش اور عیّاروں میں آقا ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ تم ہڈّی کے کھرے ہو اور تمہارے خمیر میں شاہانہ جلال ہے لیکن صرف اپنے حلقہ تک۔ تم مصلح ہو مگر اپنے احساس تک۔ تم بہادر ہو مگر اکھاڑے تک اور یہ ہے سب تمہارا احساس کمتری۔ فولاد زنگ آلود تو ہو جاتا ہے۔ مگر موم نہیں بن جاتا

اس میں شک نہیں کہ یہاں حکومت اور آزادی مرادف نہیں۔ بلکہ دونوں میں کہیں پاتال تک گہرائی اور کہیں آسمان تک اونچی حد فاصل لگی ہوئی ہے۔ لیکن تابکے! یہ سب لوگ جانتے ہیں کہ آزادیٔ حیات کا اطلاق صرف اس زندگی پر ہوتا ہے جس میں افراد و ملل مشترکہ طور پر احترام انسانیت، پاس حقوق اور صداقت کو اپنا وطیرہ بنا لیں اور یہی سیاسی ضرورت اور تاریخی تشنگی ہوتی ہے۔

---

# آزادی

صحیح آزادی اپنے ملک و قوم اور تمدن کے حدود سے بڑھ کر دنیا کی حدود اور تمدن تک فیض کے سرچشمے پہنچا دیتی ہے۔ اور یہی چیز اس کی حیات اور تاریخی اہمیت کا باعث قرار پاتی ہے۔

اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ کہ آنے والی حکومت گذشتہ حکومت کے آثار تک اکھڑوا دیتی ہے۔ لیکن وہ محل جو ایک آزاد قوم اپنی اختراع و تحقیق سے انسانی دلوں میں تعمیر کرتی ہے۔ اُسے وقت کا تند سے تند سیلاب منہدم نہیں کر سکتا!

لوگ اِس حقیقت سے مطلق بے بہرہ ہیں۔ کہ آزادی تو رُوح اور ضمیر کی بیداری کا نام ہے جس کے نصاب میں عدل و

محبت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ وہ ہمیشہ بلند معارف گہرے حقائق اور تندرست شعور کے مدارج طے کرتی ہے۔ اس کے قدم موتیوں پر ہوتے ہیں اور شانے ستاروں سے بلند!۔

آزاد قوم اپنی آواز کو دوسرے ملکوں کے ساز سے نہیں ملاتی بلکہ دوسرے ملک اس کی آواز پر نئے نئے ساز تلاشتے رہتے ہیں۔ جو تجارت کے ساتھ ذہنی شکست اور معنوی غلامی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اونچی سوسائٹیوں میں ایسے تاجر کے لئے بلند مقام نہیں۔ حالانکہ زندگی کا ایک شعبہ اس کے بغیر ویران رہ جاتا ہے!۔

وقت کی پالیسیوں اور اغراض کے طریق حصول پر عمارتیں بنانے والی آزادی دیرپا نہیں ہوتی۔ جہاں اس میں دوسری مفید اور بلند خصوصیات مفقود ہوتی ہیں۔ وہیں وہ تخلیق و اختراع سے بھی محروم رہتی ہے۔ کیونکہ یہ خصوصیات تقلیدی مہارت پر مبنی نہیں ہوتیں۔ بلکہ روح کے گہرے پن پر!

صحیح آزادی کا دارومدار قوم کے کردار پر ہوتا ہے۔ قوم کا کردار پیشوا کی تعلیم پر اور پیشوا کی تعلیم روح کے اطمینان اور مضبوطی پر۔ تاریخ اس کی گواہی دیتی ہے۔ علم و ادب اس کا عرس کرتا ہے۔ کتابیں اس کی عظمت کے نقش قدم قرار پاتی ہیں۔ اور تعلیم اس کا صدقہ جاریہ!

شروع شروع میں آزادی اپنے ہمسایہ ملکوں سے تجارتی، اقتصادی، معاشرتی، سیاسی اور اخلاقی مبادلہ اکتساب کو عیب نہیں سمجھتی کیونکہ یہ اس کے نصاب کی ابجد ہوتی ہے۔ لیکن وقت کے ساتھ علمی ہواؤں اور تجرباتی تحریکوں سے ذہنی دریچے کھلتے چلے جاتے ہیں۔ اور ان امور تک نظر رسا ہو جاتی ہے۔ جو ابھی ماہ و سال نہیں صدیوں کے عمل میں ہوتے ہیں۔ اور یہی اتحاد عمل و خیال آخر میں اس قدر مفید ثابت ہوتا ہے۔ کہ قوم کی ریڑھ کی ہڈی مضبوط ہو جاتی ہے۔ اور استقلال کو نیند تک نہیں آتی!۔

آزادی کے معاملہ میں یہ بھی خیال رکھنے کی بات ہے کہ کبھی دو ملکوں میں روحانی اور سیاسی اتحاد نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کسی ملک پر سیاسی اعتبار اور روحانی ہمدردیوں کا یقین شاہی غلطی ہوتی ہے۔ خواہ وہ آپس میں کتنے ہی دوست کیوں نہ ہوں۔

دوسرے ملکوں سے درآمد کر کے بے فکر ہو جانے والی آزادی غلامی کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ اس میں زندہ جذبات اور تندرست ارادوں کا قحط پڑ جاتا ہے۔ وہ تخلیق کی عظمت اور خرید کی پستی سے نابلد ہوتی ہے۔

صحیح آزادی تو قوت عمل کے جلوہ میں نکالتی اور ایجادات و اختراعات

کے جلو میں سفر کرتی ہے۔ تاکہ اس کے نقش قدم پتھروں پر ثبت ہوتے چلے جائیں۔ اور تاریخ ہمیشہ اس کی پاسبانی کرتی رہے۔

آزاد خیال لوگ جہاں اکتساب و اقتباس روا رکھتے ہیں۔ وہاں اپنی معاشرت کے شعبوں کو بھی وسیع اور بلند کرتے ہیں۔ لیکن وہ لوگ جو دوسروں سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی تہذیب اور معاشرت کو مسخ کرکے انہیں کی صف میں مدغم کر دینا چاہتے ہیں۔ وہ آزاد نہیں ان میں تخلیق نے جنم نہیں لیا۔ ان میں اصلاح کا جنون نہیں، وہ تو اندھا دھند دوسروں کے نقش قدم پر چلنے کو سفر کی خصوصیات خیال کرتے ہیں۔ ان میں راہ سازی اور جادہ جوئی کی صلاحیتیں مفقود ہوتی ہیں۔

حکومت کے کرتوفر اور افواج کے طنطنے تو آزادی کے دریا میں لرزتے ہوئے سائے ہیں۔ جو سورج کے ساتھ گھٹتے بڑھتے تو رہتے ہیں۔ لیکن دریا کے ساتھ سفر کرنے سے قاصر ہیں!۔

امانی شاہ کے نزدیک صحیح آزادی ایک ایسے معاشرے کا نام ہے جس میں کسی نہج سے بھی خوف ہراس نہ ہو۔

O

# نااہلی

پبلک کے جرائم میں نصف سے زیادہ ذمہ داری نااہل حکومت پر ہوتی ہے اور گناہوں میں نصف سے زیادہ ناقص پیشوایانِ مذاہب پر۔ بلند مقام حاکم غربا کے احوال سے رُوگردانی نہیں کرتا خواہ وہ کسی بھی تاریکی اور نشیب میں کیوں نہ ہوں۔ سمندر جب جھیلوں اور نالوں سے دُور ہو جاتا ہے تو رُکے ہوئے برساتی پانیوں میں بامِ آفتاب سے تبادلہ کے احکام جاری کرتا ہے۔

جب کہ علم سے عمل اور عمل سے تواتر و تسلسل جاتا رہتا ہے۔ تو بھٹکی ہوئی قوموں اور گمراہ لوگوں کی بوکھلاہٹ سے خام حکومت کی بنیادیں ہلتی ہیں۔ جرائم اگر تحریص و تعیش سے بچ کر مجبوریوں کے سایے میں سرزد

ہوتے ہیں تو غالباً وہ گناہ نہیں لیکن سماجی قوانین اور حکومت کے حصار میں ان کے لئے سزا ضروری ہے اور اس کا تسلیم کرنا نیکی!"

حقیقی حاکم وہ ہے جو آدھے راستے غلام کو اپنا اُونٹ دے دیتا ہے۔ اور غریبوں کے فاقہ مست گھروں کی تلاش میں اسکی راتیں دن بن جاتی ہیں۔ وہ جسم کی حکومت کا قائل نہیں ہوتا۔ بلکہ دلوں کی دُنیا میں اپنا سکّہ رائج کر کے مفتوح قوموں کی اجازت سے منصب سنبھالتا ہے اس کی نظر اقلیتوں سے غافل نہیں رہتی۔

نااہل حکومت کے افراد رعایا کے خون سے پلتے ہیں لیکن یہ کیسی پرخلوص حماقت ہے کہ وہ خود کو پروردگار خیال کرتے ہیں اور جو اُن کے پروردگار کو پوجتا ہے۔ اُسے ایک بندۂ ذلیل سے زیادہ نہیں سمجھتے حالانکہ وہ خود اس بدی میں مبتلا ہوتے ہیں۔

البتہ کبھی کبھی شیطان کی طرح غنڈے اور بدمعاش اُن کے بڑھتے ہوئے سیلاب کا احاطہ کر لیتے ہیں۔ اور عموماً اس گروہ میں سفید پوش سیاہ کار ہوتے ہیں کیا یہ ایک حاکم کے لئے ماتم کا مقام نہیں کہ کچھ فکر سے محروم لوگ اس کی خدمت پر فخر کرتے ہیں اور وہ بادلِ ناخواستہ ہی سہی خود کو اس کا مستحق گردان لیتا ہے۔

نااہل حاکم عوام کے لئے ظاہر دار اور اپنے سے بلند منصب کے لیے

خوشامدی ہوتا ہے! اس کا جسم اُجلا اور رُوح میلی ہوتی ہے وہ مصنوعیوں کے ذکر سے ناک بھوں پر چڑھاتا ہے کیوں کہ جب روح میں صداقت کی کوئی جوت جاگتی ہے تو نفس کی تاریکی کا طول و عرض نظر آنے لگتا ہے

ذاتی ساز و سامان کی ترتیب و تہذیب اور جسمانی آرائش و زیبائش میں اعتدال سے بڑھ کر مصروف رہنے والا حاکم عوام سے غیر مخلص فرائض سے غافل اور احکام بالا سے بد دیانت ہوتا ہے اس کے خیالات اور تصورات مُردہ، اولوالعزمی اپاہج، اور فرض شناسی مسلول ہو جاتی ہے

ذاتی اغراض اور جلب زر کے لئے جماعت کے حقوق فرد کو دے دینے والے حاکم کا ضمیر گندہ اور رُوح بیمار ہوتی ہے جس سے اس کی زندگی کے بہت سے شعبے روشنی سے محروم رہ جاتے ہیں جہاں سے عقبیٰ کے محلوں میں کھڑکیاں کھلتی ہیں۔

رعایا کے جرائم کی سزا پر تو بہر حال جیسے کیسے حاکم مقرر ہیں۔ لیکن زیوں شعار حاکموں کی بے انصافی کی سزا کے لئے غالباً محکمہ نہیں!

○

# بھیڑ چال

اس کی تقلید کر جو مجرّد ارادوں کے باعث زندگی کی گہرائی میں ڈوب کر بلندیاں نکالتا ہے جس کی نظر میں یکساں چیزیں نہیں ہوتیں اور دلِ ارادوں سے لبالب ہوتا ہے۔ جو اپنی آگ میں آپ ہی سلگتا رہتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے عرفان کا مریض اور خفائق کا چھوڑا ہے۔ اس کے ارادے میں کس بل اور خیالات میں عمق پایا جاتا ہے۔ وہ درمیانی زندگی کو مرض سمجھتا ہے لاعلاج!

اُس کی تقلید کر جس کی بصیرت اس کی عقل کے دہانے میں لگام ڈالے پھرتی ہے اور مفاد پرست طبقہ اُسے دیوانہ بتاتا ہے۔

اس کی تقلید کر جو اپنے مقصد کے سوا کسی سے بھی تعارف کر کے

خوش بنیں اور ہر چیز پہ طائرانہ نظر ڈالتا ہوا ایک ٹُٹ جا رہا ہے۔
اس کی تقلید کر جو تشنگی میں انسانیت کا منبع اور رُوح کا مدخل ڈھونڈھتا پھرتا ہے۔

اس کی تقلید کر جسے اُس کے دَور کے اُمراء نے جادوگر بتایا اور طرح طرح کی ایذائیں دیں۔ مگر وہ اپنے فکر و اندیشہ کے دامن دراز ہی کرتا رہا۔
اس کی تقلید کر جسے اُس کی آگ تکمیل کے لئے آتشکدوں میں لے گئی، شعلوں نے اس کی آگ کا احترام کیا اور پھول بن گئے۔ کیونکہ وہ اونچی ذات کی تھی

---

اس کی تقلید کر جس نے اپنے جذبے کے نشہ میں دُنیا کو شہادت کا عنوان مکمّل کر کے دیا۔ اگرچہ زمانہ آج تک ذیلی عنوان قائم کرتا چلا آرہا ہے مگر اُن کی نوعیت میں وہ خوشبو نہیں پھوٹتی جس کا رشتہ زمین و آسمان سے بلند کسی اَن دیکھی معرفت سے مِلتا ہے۔

اس کی تقلید کر جسے نااہلوں نے سُولی پہ چڑھا دیا۔ اور وہ اپنے سامنے کی بلندیوں سے نظر ہٹائے بغیر اُن سے رُخصت ہو گیا۔ کیونکہ گُھٹنے کے نیچے دیکھنا خلافِ فطرت ہے اور رُوح ہمیشہ سے اُونچی نظر اُن کی عادی رہی ہے اور یہ تقلید اُس وقت مکمل ہوتی ہے جب تبریؔ نے نشکم سیری اُن کے خاقوں سے پروانے چھینے اور تیمور نے تبسم کی جیب بیں اُن کے۔

آنسوؤں کا اجازت نامہ ہو۔ تیری خاموشی میں اُن کی چیخیں اور تیری چیخوں میں ان کے نعرے گھُل جائیں!

یہ سب تقلید کے قابل لوگ سوسائٹی کے جزو نہیں ہوتے۔ ان کی زندگی میں پردوں کا دستور نہیں بلکہ چھیدوں کا جس سے اندر کی روشنی میں باہر کا سب کچھ نظر آتا ہے۔

زندگی میں اندھی تقلید ارادہ اور ہمّت کی موت سے کم نہیں دھارے کے اتباع میں بہتی ہوئی کشتی کبھی ساحل تک نہیں پہنچتی۔ وہ تو ثبوت ہے بادبانوں کی شکستگی اور ملّاحوں کے بے سکت ہونے کا۔ تیری تخلیق تو رہنمائی کے لئے ہے نہ کہ تقلید کے لئے۔ اگر تو تقلید کے ڈھلوانوں پر اتر گیا، تو نشاروانِ زمک مخلوق کی رہنمائی کون کرے گا؟ اور خلافت و نیابت کا فرض کون انجام دے گا؟

خطرات انہیں لوگوں کے لئے ہیں جو زیرک نہیں اور بصیرت نہیں رکھتے، آنکھیں بند کر کے چلنا ٹٹولنے کی ضرورت کو حلال کر دیتا ہے۔

○

# شعر و ادب

۱

شاعری۔ قدرت اور ایجاد کے درمیان کی ایک خاکنائے ہے جس سے غیر مرئی اور مجسم چیزوں میں ایک واسطہ اور حقیقت و مجاز میں ایک رشتہ قائم ہوتا ہے۔

شاعر کی زبان الفاظ کے پھول اور تشبیہات کی جالیاں کاٹنے کی علمی مقراض ہے۔ جس پر ادب کی آب ہوتی ہے۔ یہی ایک ایسا اوزار ہے جو دل میں پیدا ہونے والے غیر مرئی خیالات جذبات اور اندازوں کو آنکھوں اور کانوں کی نشرگاہ میں لاتا ہے۔ جہاں سے بے شمار معاشی اسٹیشنوں اور روحانی اڈوں کو راستے جاتے ہیں۔

شاعر زبان کی فیکٹری کا مالک اور ادب کے معمل کا انچارج ہوتا ہے

ہر دَور کا ادب اس زمانے کی صحیح روداد ہوتی ہے جو خود بخود شاعر کی زبان پر بولتی اور قلم سے ٹپکتی ہے۔ شاعر سے زبان کا اور زبان سے شاعر کا معیار پرکھا جاتا ہے۔ ہر دور کا شاعر اپنے دَور کی زبان کا امین اور ایسا امین ہوتا ہے جو امانت کو یہ اضافہ واپس کرتا ہے۔ اگرچہ یہ اضافہ اس کے فرائض میں نہیں ہوتا لیکن فطرتاً اس کے کارنامے اس کا ثبوت ہوتے ہیں!

جب شاعر مادی دُنیا سے آگے نکل جاتا ہے تو شاعری مادی دُنیا میں وارثوں کی طرح اس کا ماتم کرتی ہے اگرچہ شاعر کی زندگی ہی میں اس کے گورکن اور کفن کھسوٹ پیدا ہو جاتے ہیں اور مرنے پہ بے روک ٹوک اس کے خیالات دُوسرے متعلقہ شاعروں کے گلے میں داخل ہوتے ہیں۔ تحقیق انہیں اصل شاعر کے نام سے محکوک نہیں کرتی مگر شہرت کا چسکا نہ جانے اس مواد کو کن کن رنگوں میں رنگ کے پہچان کرنا چاہتا ہے

شاعری صرف اس کلام موزوں ہی کو نہیں کہتے کہ جس میں ردیف و قوافی مختلف مضمون حُسن اور سلیقہ سے منظم ہوں بلکہ شاعر ہر پوشیدہ چیز کو خوبصورتی سے عوام میں لانے اور ہر نئی چیز ایجاد کرنے والے کو کہتے ہیں۔ خواہ وہ امیر ہو یا غریب جاہل ہو یا عالم کمزور ہو یا طاقتور ایجاد کا حامل اور واقعات و حالات کا امین ہونا۔ اس کی شرط ہے منقدین اکثر مقامات پر موجدوں سے اونچے اور سر سبز نظر آتے ہیں

کیونکہ ان کے یہاں ان کا سرمایہ متقدمین اور معاصرین کے انتخاب پر موقوف ہوتا ہے۔ ان میں فطری طور پر طبع زاد چیزوں کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ یا یوں کہیے کہ اپنے لئے زمین کو بونے اور جوتنے کے قائل نہیں ہوتے۔ بلکہ چڑھی ہوئی زمینوں سے خوشہ چینی کرتے ہیں وہ نئی سڑکیں ایجاد کرنے کے اہل نہیں ہوتے بلکہ وگرطے دگڈول بھر کے ایک مقام سے دوسرے مقام کا راستہ تلاش کرتے ہیں اور کچے راستوں کو شاہراہوں سے نزدیک اور بے ضرر ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں ان کی جعلی بلندی میں پیشروؤں کے خلاف ایسا مواد ہوتا ہے جس کا سہارا لگا کر وہ اپنی ذاتی پستیاں چھپا سکیں۔

بعض بعض مقلد تو انتہا درجے کے ذہین اور بے پناہ قسم کے موزوں طبع ہوتے ہیں۔ وہ پیشروؤں اور ہمعصروں کے درمیان ایک ایسی فضا پیدا کر ڈالتے ہیں کہ زمانہ اسے کوئی نہ کوئی نیا نام دینے پر مجبور ہو جاتا ہے خواہ وہ ماضی کی شہ رگ سے نچڑا ہوا حال کا لہو کیوں نہ ہو!

مقلد میں تحقیق کا مادہ نہیں ہوتا۔ وہ متقدمین کے انبار کی چھان پھٹک اور معاصرین کی بھیٹ نکالنے پر رہتا ہے اس کے مداح اس کے دوست اور صرف دوست اور اس کے مقام سے بلند آدمی اسکے حلقۂ معلومات سے باہر رہتے ہیں۔ وہ موقع پا کر ان پر تخریبی تنقید بھی کرتا رہتا ہے۔ جس میں ایک پہلو سے اس کی جھوٹی قابلیت کا پروپیگنڈہ بولتا ہے!

حقیقی شاعر ان تمام چیزوں سے بے نیاز ہوتا ہے۔ کم آمیزی اور سحر خیزی اس کے اولین اوصاف ہیں۔ اس کے افکار و تصورات عوام کے انداز فکر اور طریق تصور سے مختلف ہوتے ہیں جنہیں لوگ وجود میں آنے کے بعد سمجھتے ہیں وہ اپنے بلند مچان سے فطرت کو آواز دیتا ہے اور اس کی بانگ گذشت کا سایہ متقدمین میں جان ڈالتا چلا جاتا ہے اور بہت کچے دھاگوں کے تار پر ناچنے والے نیچے اصل مرکز سے اقتباسات کی بھیک مانگنے لگتے ہیں اس کے چہرے پر ماہ و سال اپنے نقش قدم اور روح پر جوہر چھوڑتے ہیں اس کا ظاہر کسلمند اور باطن شاداب ہوتا ہے وہ مصائب کی قیمت اور خاقوں کی عظمت کو سمجھتا ہے اس کی نظر میں جاہ و حشم کے طالب اور منصب و مقام کے شناسا حقیر اور بے قیمت ہوتے ہیں اس کے ساز سے خفائق کے نغمے بلند ہوتے ہیں اور بعض اوقات تو سوز کی شدت اور اثر کی حدت سے تار پگھل جاتے ہیں۔ اگرچہ یہ تار اس چاندی کے ہوتے ہیں جو فولاد سے نکالی جاتی ہے۔

حقیقی شاعر کی زندگی عبادت سے عبارت ہے۔ اس کی آگ میں خوشبو پانی میں روشنی مٹی میں جان اور ہوا میں حس ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ ہر انسان فطری شاعر نہیں ہوتا۔ کیونکہ شاعر فیکٹری کی چیز نہیں یہ تو پیدا ہوتا ہے اس کی روح گلوں کی عادی نہیں ہوتی اور تنہا آسمانوں کی پہنائی غاروں کے

سکون اور نباتات و جمادات کے نشو و نما سے سرگوشیاں کرتی اور اپنے اپنے پر محبت کے خوابوں کے حاشیے لگاتی انسانی درس گاہوں کی طرف چلتی ہے تاکہ ادب کو وسعت، لغت کو جامعیت، سیاست کو بصیرت اور مذہب کو ہمہ گیری عطا کر دے۔ شاعری کہیں کہیں تو لغت کا ساتھ دیتی ہے اور کہیں کہیں یہ لغات سے بلند اور اس کے احاطہ سے باہر کی بات کرتی ہے جسے لغات میں آتے ہوئے زمانہ لگ جاتا ہے محاورات اس سے چوراہوں پر متعارف ہوتے ہیں اور تشبیہات اس کے ذہن اور مناظر کے میل سے پیدا ہوتی ہیں۔ نقال یا مقلد کے الفاظ میں تاثیر نہیں ہوتی کیونکہ اس کے گودام میں تمام بکتی ہوئی چیزیں ہوتی ہیں اس کی فیکٹری کا مال کچھ دنوں تو نیلام گھروں کے توسل سے درمیانہ درجہ کے گھروں میں ملتا ہے پھر پرانی وردیوں اور گلے سڑے چمڑے کے صندوقوں کی طرح کباڑیوں کی دکانوں تک رہ جاتا ہے۔ اور پھر کچھ دنوں کے بعد گھوروں پر وہ اس سے مطلق نا آشنا ہوتا ہے کہ اس گمنام کی شہرت اور بدنام کی نکوکاری سے زندگی اور اس کا ہر شعبہ محروم ہو رہا ہے اس کی محدود نظر وقت کے جادہ پر مستقبل کی طرف سفر نہیں کرتی یہ کم سواد اور ماضی کا پھپھسا کارنامہ حال کے ہونٹوں پر لرزتا رہتا ہے۔ اگر یہ اپنا مذہب بدل دے اور اپنے اُس لمبے سائے کی طرف نہ دیکھے جو وقت کے ساتھ چھوٹا ہوتا رہتا ہے:

تو شاعری کے علاوہ اور بہت سی کارآمد شاخیں ایسی ہیں جو ادب میں بہت بلند مقام رکھتی ہیں اور افادی طور پر قوم، ملک اور زبان کیلئے مشعل راہ کا کام دیتی ہیں۔ یہ لوگ کم ہمتی کے باعث اپنی اُن صلاحیتوں کو بروئے کار نہیں لاتے جو پہاڑوں کے تھپیڑوں سے محبت اور موسموں کے عمل ان دیکھی دولت حاصل کر سکتی ہیں مگر یہ تو آنکھیں رکھتے ہوئے بھی دوسرے کی لاٹھی پکڑ کر چلنے کے عادی ہو جاتے ہیں انہیں فضائے کی چاٹ اور رسالوں کا چسکا پڑ جاتا ہے۔ یہ آئے دن دولتمندوں کے درباروں اور حکام کے دروازوں پر ملاقاتی کارڈ لئے گھومتے رہتے ہیں حالانکہ اُن کی نظر میں بھی ان کا مقام کوئی بلند نہیں ہوتا!

**خت**

اس میں شک نہیں کہ اجنبی زبانوں کے اجنبی لہجے اور فقروں کی ساخت سماعت اور زبان کے لئے غرابت پیدا کر دیتی ہے اور اس میں بیک نظر کوئی دلکشی دکھائی نہیں دیتی لیکن معانی کی لطافت اور ہمہ گیری اسے نظر انداز نہیں کرنے دیتی اور آخر کثرتِ استعمال میں آکر الفاظ کے کھردرے پہلو گھس جاتے ہیں۔ جتنے دن گذرتے جاتے ہیں۔ روانی بڑھتی جاتی ہے اور مختلف موقعوں پر سلیقہ استعمال اُسے ہر دلعزیز بناتا چلا جاتا ہے۔

**تقسیم** سے پہلے اس ملک میں دو زبانیں لستی تھیں ایک اُردو اور دوسری ہندی اور دونوں میں اس قدر رقابت اور عزیزداری ہو گئی

تھی کہ جب ایک زبان کا لفظ دوسری زبان کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر نکلتا تھا۔ تو دونوں ماں جائے معلوم ہوتے تھے۔ اس اتحاد اور ہمسائیگی کی یادگار میں ہمارے یہاں لاپنا، موتی محل، امام باڑہ، بارہ وفات، کفن چور، عجائب گھر، جیب گھڑی، پنچ فیصلہ وغیرہ کی قسم کے بے شمار الفاظ ہیں۔ اور رہیں گے۔ لیکن تمام فرقوں کا تعصب اس لسانی اتحاد میں بھی فاصلہ چاہتا ہے۔

ملک تقسیم ہوا تو ارباب نفاق نے اردو کو بھی مسلمان سمجھ کر دیس نکالا دے دیا۔ اور اب یہ مہاجر کی حیثیت سے یہاں دوسرے پناہ گزینوں کی طرح دربدری کی زندگی بسر کر رہی ہے جن کے گھروں میں یہ پلی بڑھی اور پروان چڑھی وہ غریب خود پریشان حال اور خانماں خراب ہیں تو اس کی دیکھ بھال کیسے کریں۔ لیکن یہ فطری زبان ہے اور فطرت لازوال۔

اردو زبان کے لطیف اور پہلو دار الفاظ کا قوی، دفتروں اور بازاروں میں اکثریت کی زبان کے جھلملاتے لہجوں سے دمکتے اور شرماتے پھرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ آئندہ نسل میں اکثریت کی زبان اپنے طول و عرض پر نظر کر کے اس کی پناہ گیری سے فائدہ اٹھائے اور تعاون پہ آمادہ ہو جائے لیکن فی الحال تو اس زبان کے سینکڑوں ستونوں کو توڑ توڑ کر ناقص بنیادوں میں بھرا جا رہا ہے اور یہ کوشش تخریب بیکار!

یہ نہیں کہ اس خانہ بدوش زبان میں ادب نہیں ملتا مطالعہ سے معلوم ہوتا۔

ہے۔ کہ اس میں تو ایسے ایسے جواہر ریزے مٹی میں رلے ہوئے ہیں۔ کہ دوسری زبان کے اُن بلند بانگ لوگوں کے یہاں اس کا عشر عشیر بھی نہیں جو ہمچو ما دیگرے نیست کا نعرہ بلند کرتے پھرتے ہیں اور بحث کرتے ہوئے۔ جب کہیں تحقیق کے جھکڑ چل پڑتے ہیں تو ان کے علمی فرغلوں کے دو طرفہ دامن اڑنے لگتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کا نیچے سے اوپر تک کا ایک ہی لباس ہے۔ مگر شاید مخالفت کو وہ جزو مذہب بنا چکے ہیں!

ہر زبان کی دیہاتی شاعری جسے گنواروں کی اُجڈ زبان بتایا جاتا ہے۔ اتنی لطیف اور سادہ ہوتی ہے کہ اس میں خلوص ہی خلوص اور حسن ہی حسن نظر آتا ہے اور کوئی زبان بھی اُسے اپنانے اور قبول کرنے سے انکار نہیں کر سکتی کیونکہ صداقت تو ہر جگہ صداقت ہے۔ اور تاریخ ادب کی ہر بلندی اسی کی متمنی! لیکن اس ماحول میں تو ہر نشیب میں خود پسندی کا پرچم بلند ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ آئندہ نسل سے پہلے ہی اس کا مرحوم ماضی اس کا رخ مستقبل کی طرف پھیر دے لیکن اس امید کا چراغ ذرا سنبھالا لے کر پھر جھونکوں میں لرزنے لگتا ہے۔ کیونکہ ابھی یہاں عوام میں مستقبل کے انسان ناپید ہیں اور فطری قدریں قبول نہیں کرتے!

اس میں شک نہیں کہ ہماری زبان میں آئے دن غیر زبانوں کے الفاظ اصطلاحات، محاورات، تشبیہات اور تلمیحات شامل ہوتے جا رہے ہیں۔

جن میں کچھ نرم ہیں اور کچھ سخت کچھ لوچدار ہیں اور کچھ کرخت کچھ ملائم ہیں اور کچھ ثقیل اس سے ہمیں گھبرانا نہیں چاہیئے۔ کیونکہ ہماری زبان کی ایسی نشو نما ہے کہ ضعیف لغت اور سست رفتار قواعد اس کے ساتھ نہیں چل سکتے اور روز بروز قواعد کی چار دیواری سے باہر کی لفظی مخلوق بڑھتی معلوم ہوتی ہے اور یہ ہی حقیقت میں آثار حیات ہمارے پاس جس قدر اصول و قواعد موجود ہیں اگر مذاق سلیم ساتھ دے تو انہیں اوزاروں سے بہترین آرائش ہو سکتی ہے جنہیں ہم اپنی ضرورت کے لئے ناکافی سمجھ رہے ہیں اس سے یہ مقصد نہیں کہ دیگر زبانوں کا ادب سر سے پاؤں تک طاری کر لیا جائے اور اس کو اوڑھنا بچھونا سمجھ بیٹھیں اس میں شک نہیں کہ ہر ملک کے تمدن اور زبان و ادب میں حسن موجود ہے لیکن سراپا حسن کسی بھی ملک کو نہیں کہا جا سکتا اعتدال ہی کا پیمانہ صحیح پیمانہ ہے!

ہمیں اپنے یہاں کے مقامی الفاظ اور قصباتی محاورات سے بھی غافل نہ ہونا چاہیئے یہ بھی ایک بڑی تلخ گمراہی ہے۔

کیونکہ جب یہ روزمرہ اور محاورات دوسری زبانوں کے سانچے میں برمحل استعمال ہوتے ہیں تو تغزل اور تحریر کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ نیز کلام و قلم میں تاثیر کی کمی نہیں رہتی۔ اور فصاحت و بلاغت کا ایسا قوام بن جاتا ہے جس میں یکسانیت ہونے کے باوجود سوتہ و لحمہ کے عناصر ناپے تولے جا سکتے ہیں۔

حکومت اگر ملک بھر میں درسگاہیں اور تعلیمی مراکز ایک افادی نقطۂ نظر سے قائم کر دے جس میں حقیقی والدین کی طرح سب پر دستِ شفقت رہے۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے مذہبی اور سیاسی نظریات میں اتحاد پیدا نہ ہو اور جب اتحاد ہو گیا۔ تو تمام فرقہ وارانہ مناقشات کالعدم ہو جائیں گے کیونکہ ہر شخص کے سامنے تعمیری سوال رہے گا۔ وہ کسی بھی شعبہ کا کیوں نہ ہو ہر شخص اپنے حلقے کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کرے گا!

اگر نظامِ تعلیم اس انداز کا ہو گیا۔ تو ڈگریوں کے لحاظ سے ہمارے ملک میں ایک موسم بہار کے بعد معلوم ہو گا کہ ہر نوجوان خواہ وہ کسی قریہ سے تعلق رکھتا ہو ملک کا سپوت اور فرمانبردار بیٹا ہے اور افراد کے اجسام علیحدہ ہوتے ہوئے تمام کے تمام محبت کی ایک زنجیر میں منسلک ہیں جو دوسرے ملکوں کی زبانوں اور فنون سے اپنے ملک کی بہبود کا تہیہ کئے ہوئے ہیں!

ایسی صورت میں ادب و شعر کا معیار بھی قومی صلاحیتوں اور مقاصد عالیہ کے لحاظ سے مقرر ہو گا۔ اس میں کورانہ تقلید کی دشواریاں اور پیچیدگیاں نہیں ہوں گی کیونکہ نظام کی صحت ہی سے تو مستحکم قومیت اور صداقت قائم ہوتی ہے۔

میں دریافت کرتا ہوں کہ نظامِ تعلیم دُرست ہو جائے تو پولیس کی ضرورت کس حد تک باقی رہ جاتی ہے؟

# نیکیوں کی سیر

تجارتی اداروں میں ایسے لوگ بکثرت دیکھے جاتے ہیں جو اپنی انفرادی تعمیر و ترقی کو نیکی کہتے ہیں۔ لیڈروں کا حلقہ بھی ایسے لوگوں سے خالی نہیں جو بلندیوں کی مسماری اور خرابی کو نیکی کا نام دیتے ہیں۔ ایسے درویش بھی نظر سے گزرے ہیں جو اپنی پستی کے اظہار کو کارِ ثواب خیال کرتے ہیں اور اسی پر نغمہ اور مطمئن ہیں۔ وہ اس نظریئے سے خراب و خستہ زندگی بسر کرتے ہیں کہ موت کے بعد کی زندگی انہیں مغموم نہ کر سکے۔ حالانکہ یہ تو کھولت ہے رُوح کی اور رِق ہے جسم کی۔ درویشی تو نام ہے حکیم حیات اور فیاض کردار کا جو مستقبل کے لئے دعا کو جد و جہد پر ترجیح نہیں دیتا اور اپنے آرام کا وقت عبادت ہی میں صرف کرتا ہے!

کچہریوں کے احاطوں اور قوانین کے دائروں میں عموماً ان لوگوں سے ملاقات کا موقع ملتا ہے جو بیخبر دلوں اور باخبر جسموں کو نیکیوں کے آئینے سمجھتے ہیں۔

خانقاہی دنیا میں کثرت سے ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو گناہوں کی لیسدار دلدل میں سینے تک دھنسے ہوئے ہیں اور اس دلدل میں ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ کر لیٹ جانے اور چپ سادھ لینے کو نیکی بتاتے ہیں!

چوروں اور ڈاکوؤں کے مرکزوں میں بھی نیکی کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور وہ اپنی شقاوت اور سفاکی ہی کو نیکی بتاتے ہیں اور اپنے اراکین کو مرکزی بنیادوں کی طرف راغب رکھتے ہیں!

کبھی کبھی سرِ راہ ان لوگوں سے بھی مڈبھیڑ ہوتی ہے جن کی ذرا بھر نیکی وسیع اور برائے نام عمل انلارج ہو کر ایسے حریری ہو گئے کہ ان کے مسکراتے ہوئے گناہ اور دیدے مٹکاتی ہوئی بدچلنیوں کے چہرے صاف نظر آتے ہیں۔

ان تسبیح بدست حضرات کی زیارت سے بھی سرفراز ہونے کا اتفاق ہوتا ہے جو اپنی کھوکھلی نیکیوں کے بوجھ سے گھبرائے پھرتے ہیں اور ان کے ہونٹوں پر سرسامی گفتگو جاری رہتی ہے۔

اُن حال کھیلتے ہوئے جعلی صوفیوں کی خدمت میں بھی حاضری کا شرف حاصل ہوا کہ جب اُن پر اُنکی دوغلی نیکیاں طاری ہوتی ہیں تو دیکھنے میں بیدکی بسنزا اور کوڑھوں کی مار کا تشنج معلوم ہوتا ہے اور رقص کرتے ہوئے برف کا

پانی مانگتے ہیں۔

شاعروں اور ادیبوں میں بیشتر ایسے لوگوں سے تعارف ہوتا ہے، جو منافقت کی ٹوپیاں اوڑھے علمیت کے کھوٹے تمغے لگائے گارے کے بغیر اپنی شہرت کی دیواروں پر روڑے رکھ رہے ہیں۔ بارہا دیکھا کہ ان کے ہونٹوں کے گرد مسروقہ الفاظ کے سائے بھنک رہے ہیں۔ ان میں جوہرِ قابل کے بجائے زمانہ سازی ڈیرہ ڈالے ہوئے ہے۔ ان کے خلوص کو ہر دلعزیزی نے عمر بھر کے لئے انسانیت کے اسکول سے خارج کر دیا ہے! اور وہ اسے سعادت اور نیکی خیال کرتے ہیں۔

جعلی شاعر اور نقلی ادیب کا بڑھاپا پہلوان، طوائف اور رنڈو کے بیل کی طرح گزرتا ہے۔ کیونکہ یہ زندگی میں شاعری کو ذریعۂ معاش قرار دے لیتے ہیں اور معاش کے دیگر ذرائع اُن کی نگاہ سے اوجھل ہو جاتے ہیں، یہ لوگ تواضعات اور عقیدت کو نظر میں نہیں لاتے۔ ان کی دوستی کے احاطہ میں مکانیت نہیں ہوتی۔ جب ان کی دروغ بافی کہیں تعمیرِ ملت اور نیکی کے نام سے پکاری جاتی ہے تو اُن کی باچھیں کھل جاتی ہیں!

یہ وہ گروہ ہے جو حقیقتوں کے گرد مٹی اڑاتا رہتا ہے اور اس کا تاریک وجود عقبےٰ کے روشن مستقبل تک نہیں پہنچ سکتا۔

کون سمجھتا ہے کہ نیکی خود اپنی اُجرت ہے!

جو لوگ ماضی کے نقشوں پر چلتے اور پُرانی قدروں سے نئے دور میں عقبے کے حصول پر زور ڈالتے ہیں۔ غالباً وہ انسانی ارتقار کو پیشِ نظر نہیں رکھتے اور نہ آرائشِ کائنات اور خدمتِ خلق کو عبادت اور نیکی خیال کرتے ہیں اور یہ ایسی بے پروائی ہے جس کے کان باہر نہیں۔

بھلا جو نیکی اور بہبودِ زندگی سے حاصل نہیں ہو سکتی وہ عوامی موت کہاں سے دستیاب کر سکتی ہے ؟

کاش دنیا یہ سمجھ لے کہ نیکی نام ہے فطری اور عملی طور پر قوانینِ فطرت سے سازگاری کا اور اسی ایک تعریف سے زندگی ابدی قدروں پر قائم ہو کر کردار کو وسیلۂ نجات بنا سکتی ہے، ورنہ قدامت پرستی، بدراہی اور تشکیک تو نہ ہوشمندی ہے نہ پیش بینی، نہ یہ ذمہ دارانہ عمل کی تقاضی ہے۔ نہ مقتدرانہ فرائض کی جن کے حوالے ازل کی داغ بیل اور ابد کی وسعت سے آگے تک سُنے جاتے ہیں۔ کیونکہ نیکی کی منزلت نسبتی اور عطیۂ فطری ہے۔

# قیادت

ابھی اِس دور کا قائد قوم کو مشکلات کے اُس خطّہ اور فیصلے کے اُس مرحلے پر نہیں لا سکتا۔ جہاں اخلاقی فضائل اور فطری اصولِ حیات کے بغیر چارہ کار نہیں رہتا اور جو صحیح شرط ہے انسانیت کی اِس عمل کے نتیجے میں اجتماعیت کے دامن سے کوئی فرد نہیں گر سکتا۔ اور کشمکشِ حیات کا کوئی عقدہ ایسا نہیں رہتا جو خود بخود نہ سُلجھ جائے!

قیادت کی شرط عبقریت نہیں بلکہ عظمت ہے! کیونکہ عبقریت غیر متوازن اور ناہموار ہوتی ہے۔ اِس میں تو زندگی کا کوئی پہلو خلافِ توقع نمایاں ہو جاتا ہے۔ باقی نقائص کی حدود میں راستہ بھول جاتے ہیں اور رفتار کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

قیادت تو نام ہے کائنات کے تقاضوں، احتیاجوں اور آرزوؤں کو اپنانے کا۔ ورنہ معمولی کپڑے تو برساتی پانی سے بھی دُھل جاتے ہیں۔

اس بدبخت دَور میں ایسی بصیرت کہاں کہ لوگ اصل اور نقل میں تمیز کر سکیں انھیں کیا خبر کہ لیڈری تو نام ہے اپنے خون میں دُنیا کے حقوق کو پہچاننے کا اور اپنی رُوح کو بار آور دیکھنے کا۔

سادہ کار اور نقال بھی ظاہر میں ایسی ہی قیادت کرتے ہیں جو اصل سے مشابہ ہوتی ہے۔ لیکن ان کی قیادت کے پائے نہیں ہوتے بلکہ دائیں بائیں اور پیچھے تکلف اور بوکھلاتے اخلاق اس کے بازو تھامے رہتے ہیں۔

ایسے قائدں کی جیب میں ملاقاتی کارڈ ہوتے ہیں اور نااہل حکّام کے چور دروازے ان کے منتظر!

ان کے چرمی بیگ میں ریا کے سرٹیفیکیٹ، تملّق کے فوٹو اور غداری کے عکس ریز ملتے ہیں۔ جن میں ان کی تہذیبی خامیاں اور ننگی جعلسازیاں منمناتی ہیں۔

جہاں ملک کی جہالت و غفلت اور عوام کے اندھے پن کے باعث لیڈر بکثرت بنتے ہیں وہیں اُس چُندھی اور بدبخت مخلوق کی رہنمائی بددیانت حکومت کے خطاب یافتہ اور خاندانی مفاد پرست بھی کرتے ہیں۔ انہیں کیا خبر کہ شرافت نفس اور حبِ انسانی مُتعدد غلاموں کے حصّہ میں نہیں

آتی ہے تو وہ ہے جو معتقدات کو عظیم، بلند، وسیع اور قابل احترام قرار دیکر ناقابلِ شکست بنا دے اور پھر اسی پاک بلندی سے غریبوں، غلاموں، بیواؤں اور یتیموں کے لئے ایسے احکام جاری کرے جن میں سیرتوں کی تعمیر اور دلوں کے معبدوں کی مرمت سب سے پہلے ہو۔ اس کے فرمان کا ہر لفظ تالیفِ قلوب کے ساتھ جذبۂ پیکار کا منادی بھی ہو اور ہمدردی و جاں نثاری کا علمبردار بھی، اس کا دل رحم و انصاف کا سنگم بھی ہو اور نظر زمانہ پیما بھی۔

وہی قائد گونج کر ایوانِ حکومت میں شگاف لگا سکتا ہے جو سماجی شکایات سے آگاہی کے ساتھ ہمدردی بھی رکھتا ہو اور فراعنۂ وقت سے یہ ذہن نشین کرا سکے کہ مزدوری اور مشقت کا پیشہ بھی اُسی قدر قابلِ احترام ہے جتنا اور دوسرے پیشوں کو خیال کیا جاتا ہے۔

مگر اس دور میں عذاب یہ ہے کہ کسی تعمیر میں بھی مزدور، معمار، سادہ کار، لوہار اور بڑھئی کا عنوان نہیں ملتا۔ اس کے برخلاف ان لوگوں کے نام زندہ رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے جنہیں فطرت زندہ دفن کر دینے کے لئے پیدا کرتی ہے۔

جعلی لیڈروں کی بلندیاں تو سرکاری خوشامد پیشگی پر مبنی ہیں؛ انہیں اس مسئلہ پر غور کرنے کی کیا ضرورت ہے کہ ایک اچھے کاریگر کے مقابلہ میں ایک بے فیض مفاد پرست بے انصاف حاکم نااہل ثالث اور غافل۔

کو توال سب کے سب واجب القتل ہیں۔

اس کے اظہار میں ان کی شہ رگ کھنچتی ہے کہ صحیح عظمت اور احترام کا حقدار کامی کا کام ہوتا ہے نہ کہ ضمیر کا کوڑھ، رُوح کا ذُبل اور زبان کا ناسور وہ اس خیال کو دل میں جگہ دے کر رُوح پر جھٹکا کیوں محسوس کریں، کہ مالک اور مزدور یکساں طور پر ملک اور قوم کی بہبود کے علاوہ عوام کی سہولتوں کے امین ہیں مگر آہ ان کے جسم تو شراب و شاہد کے جوڑ رہے ہیں۔ اور اُن کی رُوحیں گندے اور سڑے ہوئے مواد کی عادی! اس دور کے قائد عموماً اپنے ایمان کے جائزے کو روا نہیں سمجھتے بلکہ حال کے ایمان کو ماضی کی غلط بنیادوں پر بلند کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ مستقبل کی سنہری بلندیاں انہیں اشارے کرتی رہتی ہیں لیکن یہ تاریکی میں ڈوبی ہوئی پر خود غلط مخلوق اپنی افکار سے دوسروں کے قندیل جلانے کا دعوے تو کرتی ہے اور اپنے سینے کی سیاہ دوزخ پر نظر نہیں کرتی!

غلام ملک کا قائد اپنی فطری خامیوں کو دھوم دھڑکے میں چھپانا اپنی خصوصیت قرار دیتا ہے لیکن کیا بُرائی کو چھپانا بُرائی کی حفاظت کرنا نہیں۔ بغیر اس ذاتی ملکیت سے انکار کہاں کی دانائی ہے!

ناقص قائد سیاسی پلیٹ فارم کی اصلاح کو عوام کی اصلاح اور ملک کی خدمت خیال کرتا ہے۔ حالانکہ معاشی اختلافات کی ہم آہنگی کے بغیر

اصلاح کسی صورت میں بھی ممکن نہیں اور یہی ایک شعبہ ہے جس پر اب تک ہمارے مفکرین نے غور و خوض کی زحمت نہیں کی !

یہاں نیک سیرت انسانوں کو نیک نیتی سیاست میں داخل کرتی ہے مگر باطل پرستی، اقربا نوازی اور محسن کشی کے الزام میں اُن سے استعفے طلب کئے جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ مذہب اور تعلیم کے قندیل ہاتھ میں لیکر چلنا نہیں جانتے اور خود پروری کے وحشی تعصب کی غذا پر جینے لگتے ہیں۔

سچے قائد کا پہلا فرض ہے کہ وہ افراد ملت کو اپنے فرائض کی بجا آوری پر مائل کرے۔ کیونکہ فی مابین اور حکومت کے متعلق لوگ اپنے فرائض ادا کرنے لگیں تو حقوق کا مسئلہ آسانی سے طے ہو جاتا ہے۔

حقوق کے معاملہ میں غلامی کے ماحول کی ترغیب آزادی کے ماحول سے مطلق جدا اور الگ تھلگ ہوتی ہے۔ آزاد لوگوں کا پہلا فرض اپنی کوتاہیوں پر نظر ڈالنا ہوتا ہے۔ وہ اپنی ہر خامی کی اصلاح کو واجبات سے تسلیم کرتے ہیں !

○

# حُسن

اصل حُسن تعریف سے بالا ہے اور کیوں نہ ہو جبکہ وہ نظر سے پوشیدہ ہے اس کی تعریف تو نظر سے پوشیدہ طاقت ہی کر سکتی ہے!

شاعری کا حُسن وہ ہے جو اوزان و بحور اور الفاظ کی بند کھڑکیوں میں کراہتا ہے۔ جس کی آواز صرف دل ہی سُن سکتے ہیں، نگاہیں اس کی صورت اور کان اس کی آواز سے محروم ہیں! اور روحیں اس کے لئے اپنے فاصلوں کو قربتوں میں تبدیل کر دیتی ہیں۔

مصوّری کا حُسن رنگوں اور لکیروں میں نہیں۔ اُس کا حسن تو وہاں ہے جہاں رنگ زندہ اور خطوط جاندار معلوم ہوتے ہیں۔ یا پھر اس جگہ جہاں دو خط نامعلوم طور پر اپنی حدیں ملا دیتے ہیں۔ وہاں کوئی خط ثابت نہیں

کیا جا سکتا۔

موسیقی کا حُسن غزل کے مضمون اور دادرے کے بول میں نہیں بلکہ اُس کا حُسن تو رُمح کی چیخ اور آواز کے سوز سے ملی ہوئی اُس کیفیت کا نام ہے جو تان کے زیر و بم میں لرزتی اور سماعت کے دروازوں سے دلوں پر پرچھائیاں لہراتی پہنچتی ہے اور ساز اس کے جلو میں اس کے دامن سنبھالتے ہوئے کہیں کہیں پیچھے رہ جاتے ہیں۔

بت تراشی کا حُسن پتھروں کے رنگ اور کاریگر کے آہنی قلم میں نہیں بلکہ اُس کا حُسن تو وہ ہے جس نے بُت کو چٹان کے سینے سے نکالا ہے۔ اور خود کو قابلِ فہم بنانے کی کوشش کی ہے!

حُسن انسانی گلابی رخساروں اور سڈول اعضا میں ہرگز نہیں بلکہ حُسن تو وہ چیز ہے جو تناسب اور موزونیت کے پردے سے دعوتِ دینا ہے۔ اور نگاہیں زیادہ سے زیادہ اس کے پردے کو چھو سکتی ہیں اور بس!

حُسن، شاعری، مصوری، موسیقی، بت تراشی، عشق، ادب اور محبت وغیرہ یہ سب ایسے مذاہب ہیں جو تبلیغ کے محتاج نہیں اور مقاصد سے ہٹ کر غیر مادی بلندیوں پہ نظر رکھتے ہیں۔

نہ جانے کتنی قوموں کی غیر فطری خونریزیوں میں ان مذاہب کے ایسے امن آفریں رشتے ملتے ہیں کہ تاریخ میں ان کی عظمت کا کوئی نام نہیں!۔

سیاست ہر تمدن کے لئے لابدی سہی یہ حسین فریب ادب اور آرٹ میں کیاریاں بنانے سے قاصر ہے اور رہے گا!

(۲)

حسن ہمیشہ آغوش کھول کر چلنے کا عادی ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ عشق اپنے دامن میں آتشگیر مادے رکھتا ہے۔ جو خود بخود بھڑک اُٹھتے ہیں۔

جب حسن کے رنگ و روغن سے عمر کا سورج پشت پھیر لیتا ہے تو حسن کی آنکھوں کا سفید موتیا دور ہو جاتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ عشق کا خاک بسر قافلہ اس کی حدود سے دور نکل چکا ہے اور دنیا اسے اب عوام کے گلے کی طرف ہانک رہی ہے۔ اُس وقت اُس کے شباب کے ایام کی یاد اُس کے سینے میں ناسور ڈال دیتی ہے اور کبھی جب عشق مڑ کر دیکھتا ہے تو حسن کی میت نظر آتی ہے!

حسن ہمیشہ عشق سے بلند ہو کر ملتا ہے اور پست ہو کر جدا ہوتا ہے کیونکہ جب ذرا نزدیکی ہوتی ہے تو اس کے عیوب بولنے لگتے ہیں اور عشق اُنہیں حیرت سے دیکھ کر منہ پھیر لیتا ہے۔ ایسے موقع پر بعض اوقات تو حسن گھٹنے ٹیک کر اپنا جعلی لبادہ اتار پھینکتا ہے اور نیچی

نظروں سے شکست کا اعلان کردیتا ہے اور بعض اوقات مقام بدل ڈالتا ہے تاکہ زیادہ نہ پڑھا جاسکے۔

حسنِ ریشم کا وہ کیڑا ہے جو جسموں کے لئے کیف و آسائش دیکر ذلیل موت مرتا ہے کیونکہ وہ ہری جگہ ہوتا ہے اور شہتوت کی کونپلیں اس کی من بھاتی غذا ہیں۔ وہ ایک بار کے بعد ریشم نہیں دے سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی موت پر جی نہیں کڑھتا۔

## (۳)

بزرگی کا حسن بردباری ہے اور عالم کا حسن تبلیغ۔ اگر عالم یا بزرگ ان دونوں سے غافل ہے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ اپنے مقام پر نہیں۔

اسی طرح ڈاکو کا حسن خیرات اور بدمعاش کا حسن محلہ کی حفاظت ہے۔ اگر ڈاکو خسیس ہے اور بدمعاش اپنے حلقے کے نوجوانوں کے کیرکٹر کی حفاظت نہیں کرتا تو نہ وہ ڈاکو ہے اور نہ وہ بدمعاش بلکہ ایک گرہ کٹ ہے اور دوسرا لفنگا!

بدمعاشوں کی تین قسمیں ہیں:۔ بدمعاش، غنڈہ اور لفنگا۔

بدمعاش محلہ بھر کی بہو بیٹیوں اور نوجوانوں کے کردار کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ یہ تھانے اور عدالت کے سوا کہیں جھوٹ نہیں بولتا۔ یہ امیروں سے

لے کر غریبوں میں تقسیم کرتا ہے۔

**غُنڈہ:-** معمولی قسم کے لوگوں کو دھمکا کر چھوٹی چھوٹی رقمیں وصول کرتا ہے اور دوسرے غنڈوں میں اُسے بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے۔ یہ جھوٹ کو عزت اور شیخی کو اپنی خصوصیت سمجھتا ہے۔

**لفنگا:-** یہ غنڈہ سے کم درجے کا انسان ہوتا ہے جو دکانوں کے تھڑوں، تکیوں اور چوپالوں میں مقامی سیاست کے بے سر و پا فسانے بنکارتا پھرتا ہے۔

قمار خانوں کی چوکیداری اور غنڈوں کی مخبری اُس کا ذریعۂ معاش قرار پاتا ہے۔ اس کی فطری بزدلی اور دبوپن اُسے اپنی سطح سے بلند نہیں ہونے دیتا۔

بعض جوانی ہی میں اور بعض جوانی سے گزر کر پولیس کے مستقل گواہ بنجاتے ہیں۔ جو عدالتوں میں آئے دن جھوٹے حلف اُٹھاتے ہیں۔ اس کے بعد ان کی ترقی حاکموں کی چاپلوسی تک آجاتی ہے۔ اس کے صلہ میں کبھی کبھی یہ لوگ نمبردار، ذیلدار، چوھدری اور اسی قسم کے معمولی اعزاز پا جاتے ہیں جس سے ان کی عقبیٰ تاریک اور ایمان ڈانواڈول رہتا ہے۔

○

# عشق

جب عشق تک حسن کی ٹھنڈی ہوا نہیں پہنچتی تو یہ خود اپنی آگ میں جلنے لگتا ہے۔ اس وقت انسان اپنے ہر جذبہ سے مغلوب نظر آتا ہے اور پناہ کی طلب اُسے دشمنوں کے دامن تک لے جاتی ہے۔ اس وقت اس کی امیدیں اجنبیوں کی قدمبوسی کے خواب دیکھتی ہیں!

بعض اوقات جب عشق، حسن کی پستیوں کو دیکھ پاتا ہے تو اپنے گناہ کی پاداش میں خود سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ حالانکہ اسے اس کی مخلص بدگمانیاں اور ہمدرد شکوک قدم قدم پر روکتے ٹوکتے اور نفرت دلاتے رہتے ہیں!

عشق میں ایک ایسا وقت بھی آتا ہے کہ طالب، مطلوب دو بے اعتماد

مسافروں کی طرح محبت کے دن گزارتے ہیں اور ہر وقت خطرہ رہتا ہے کہ ایک دوسرے کو غیر محفوظ پا کر لوٹ نہ لے۔ بائیں وقت روحیں محبت کے اشغلوں پر غور و خوض میں مصروف رہتی ہیں اور دونوں طرف سے نطق و سکوت مصلحت اور احتیاط سے خالی نہیں ہوتا۔

عشق جب درد بنتے بنتے دوا کی صورت اختیار کر لیتا ہے تو اس کی نظر بے پروا اور دل غافل ہو جاتا ہے۔ اس کی نظر میں حسن کا احترام نہیں رہتا اور نہ وہ ایثار کی قیمت لگا سکتا ہے!

عشق کی لذت میں ذائقہ کا ردّ و بدل بیماری کے دورہ سے کم نہیں کیونکہ یہ اخلاق شکن اور غیر معصوم حرکت ہی نہیں بلکہ ایک سوقیانہ فعل بھی ہے مگر صاحب احساس اور غیرت مند کے لئے!

عشق ایک تشنۂ تحقیق داعیہ ہے اور جب یہ اپنے لطیف راستوں سے بھٹک کر لمس و ہوا کے حدود میں آ جاتا ہے تو غیر ذمہ دار جذبات اُسے بازاروں میں گھسیٹ لاتے ہیں جہاں اس کی کوئی بھی قیمت نہیں رہتی۔

عورت سُنکر ہی عشق میں مبتلا ہو جاتی ہے اور جب دیکھتی ہے تو اُسی میں کھو جانا چاہتی ہے لیکن مرد دیکھ کر پانے کی کوشش کرتا ہے اور حاصل کر کے برباد کر دیتا ہے۔

# بُوڑھے

جاننے والے جانتے ہیں کہ انہیں نیند کیوں کم آتی ہے ۔ بدی جب ضمیر سے مخلصانہ گفتگو کرتی ہے ۔ تو ضعیفی کی شب بیداری کو اپنا تانا بانا بناتے اُسے باک نہیں ہوتا ۔

ان کے لئے بہتر یہی ہے کہ اپنی بیداری کے نشیب کو اُن نیکیوں سے پُر کریں جو روح کے لئے بھنگ کا کام دیتی ہیں اُن کی روح کے لئے یہ سبز بھنگ بڑی مفید رہے گی ۔ کیونکہ تشدّد اور بھنگ میں ایک غیر مرئی دیوار ہے جسے تشدّد عبور کر سکتا ہے نہ بھنگ !

---

بدی سے اس لئے تعاون مناسب نہیں کہ ضعیفی کی آب و ہوا میں یہ بزدل ہو جاتی ہے اور جوانی میں حد اندیش رہتی ہے ۔ اور کبھی یہ شیخی کا

سایہ معلوم ہونے لگتی ہے۔

جو ضعیفی جوانی کے واقعات کی جگالی نہیں کرتی اس کا ہاضمہ صحیح اور دماغ تندرست ہے۔ وہ حیوانی حدود میں نہیں آتی، کیونکہ وہ ماضی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر چلنے کی عادی نہیں ہوتی۔ بلکہ مستقبل کے پلّے سے پلّہ باندھے رکھتی ہے۔ ایسی ضعیفی کے مستقبل کی بیشمار روحانی اور جسمانی کھادر باگر طے کرتی ہوئی ایسے موڑ پر آجاتی ہے جہاں یاس و اُمید سے بلند ایک غیر مرئی اور غدّار شہر نظر آنے لگتا ہے جس کی ہر چھت پر ابدی آزادی کا جھنڈا لہریں لیتا رہتا ہے۔ ضعیفی، ایمان داری، خوف اور عبادت کے پھلوں کو اس وقت پسند کرتی ہے جبکہ اس کا معدہ کمزور ہو جاتا ہے۔ یہ تو جوان ارادوں کی غذائیں ہیں جو شباب ہی میں اُن کے خوگر ہو گئے وہ ضعیفی میں سونا، چاندی، مونگا اور مرجان بھی ہضم کر لیتے ہیں جو روحانی شباب کو قائم رکھتے ہیں!

جنھیں بڑھاپے میں عملیات کا دورہ پڑ گیا یا جو عبادت میں مبتلا ہو گئے مجھے اُن سے ہمیشہ الجھن رہی ہے کیونکہ یہ ہے جد و جہد اور سعی و عمل سے بغاوت!

اگرچہ عبادت بھی ایک جد و جہد کی قسم ہے جس سے روح تندرست رہتی ہے لیکن جب تک جسم جواب نہ دیدے اسکی بخشش کے کالا غذات پر غور کرنا دانائی نہیں۔

جو جوانی روح اور جسم دونوں کی سعی کو رُوا خیال کرتی ہے وہ قابلِ تقلید ہے۔

# جائزے

ایک دن میں ایک مل کے مالک کا مہمان ہوا۔ اس کی آنکھوں نے دل سے بالا بالا میرا احترام کیا۔ میں مطمئن تھا۔ شام کو موقعہ پاکر میں اس کے ڈھانچہ میں داخل ہو گیا۔ تھوڑی دیر تو میں چاروں طرف سفید دیواروں اور ریشم کے رنگین پردوں سے خوش ہوتا رہا۔ اتنے میں میرے ضمیر نے حسبِ عادت محاسبہ کے لئے دستک دی اور مجھے پسینے آ گئے۔ پھر اس کے چند دولت پرست دوست آ دھمکے۔ اور اُن کی گھبراہٹ نے اپنی ہول دلی کے لئے شراب تجویز کر لی۔

---

بوتل کھل گئی۔ اُن سب کے ضمیر دروازوں پر اُن سے علیحدہ کھڑے ہو گئے کئی بار میرے ضمیر کو بھی اشتیاقِ ذوق نے بلانا چاہا۔ مگر یہ تھا کہ میرے سامنے کھڑا

دانت پیس رہا تھا۔ دن بھر کی عیاریاں جعلسازیاں اور حرام خواریاں نفسِ امارہ کی اس مختصر سی مجلس میں ننگی اچھل رہی تھیں۔

رفتہ رفتہ شراب رگ و ریشہ میں بہتی گئی اور آنکھوں کے آگے نشہ کی ایک وحشت اثر دھند آتی چلی گئی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ انسانی فرائض کے بعد دیگرے اُن کے منہ پر تھوک تھوک کر رخصت ہو رہے تھے۔

جب نشہ تنت پر آگیا تو ایک بیوہ کو زینتِ آغوش بنانے کے لئے بلایا گیا۔ وہ بھوکی تھی اور ایک بچّی کی ماں قوم کے امراء کا غریب نطفہ! اس کی آنکھوں میں ایک تجسس تھا۔ اور وہ دروازہ کے پاس زمین پر بیٹھی اپنے پاؤں کے انگوٹھوں پر نظریں گاڑھے ہوئے تھی جیسے وہ ان تمام جسموں کی روح ہے جو پست ہو کر غلیظ عناصر کے گھیرے میں آگئی ہے۔

اتنے میں ایک سازندہ نے آکر سلام کیا۔ اس کے چہرے پر حرام روزی نے سیاہی پھیر رکھی تھی۔ اُس کی مونچھیں شیطان کی چٹیا کے دو حصّے معلوم ہو رہے تھے۔ جیسے اس نے دُنیا کی ہر بدی کو چکّھا ہی نہیں چاٹا ہے بیوہ چار آنے دے کر رخصت کر دی گئی۔

سازندے کے اشارے پر ایک خفیف الجثّہ عورت بھی کمرے میں آگئی۔ اگرچہ اُس کا حسن بازار کی جنس بن چکا تھا لیکن اس کے باوجود اس میں ابھی کبھی زندگی بھی سانس لے رہی تھی کیونکہ وہ اخلاقی بلندی سے اُتری ہوئی تھی۔ کمرہ میں

ایک تعلیم یافتہ آواز ساز کا سہارا لے کر گونجنے لگی۔

وہ لوگ نشہ کی جھانجھ میں داد و تحسین کے ساتھ درختوں کی شاخوں کی طرح جھوم رہے تھے اور اس کی روح کی اس روشن دھاری سے مطلق بے خبر تھے جو کبھی کبھی نغمہ کے ساتھ اس کے ضمیر کی چیخ سے پیدا ہوتی تھی۔ ایک بار گاتے گاتے جب اس کی نظر نے اپنے داهنی تک مار کی توندیں سے یہ محسوس کیا کہ اس کے نغمے کے پاؤں اُکھڑ گئے۔

صبح ہو گئی اور تشنج آلود جسموں نے اُسے کالج سے واپسی پر آنے کے وعدے پر رخصت کیا اور ساز ندہ کو چالیس روپے دے دیئے۔

صبح ہو رہی تھی مگر میں سورج نکلنے سے پہلے اس ڈھابچے سے نکل آیا اور کئی دن اس قسم کے آدمیوں سے بچ بچ کر چلا۔

(۲)

چلتے چلتے ایک دن میں ایک کٹ ملاں میں گھس گیا۔ موجودہ دور کے کٹ ملاں میں۔ میں نے دیکھا کہ حقیقی زندگی سے دور اس کی زندگی ایک جلوس کے ساتھ جا رہی ہے جس میں ریا کاری کی چھڑیاں ہیں اور جھوٹے ضمیروں کے ڈھول بج رہے ہیں۔ شیطان نے ایک انگریزی کے عالم کو لگام دے کر سواری میں لے رکھا تھا اور وہ خچر اسکے اشارے بغیر اس اننوہ

کو ایسی مذہبی تباہی کی طرف لے جا رہا ہے جہاں میلوں تک کھولتی ہوئی دلدل کے گڑھے ہیں اور دلدل میں جگہ جگہ دوزخیوں کے مراکز۔ وہاں لوگوں کے ہاتھوں میں علم کے سلگتے ہوئے جھنڈے اور حکمت کے بھبکتے ہوئے پرچم ہیں۔ جن کے شعلے اُن کے سروں پر منڈلا رہے ہیں۔ اور دھوئیں نے ان کی آنکھیں سُرخ کر دی ہیں۔

اس جلوس کا علم لنگڑا اور تبلیغ کام چور ہے۔ ان کی بیداری غفلت کا مقابلہ نہیں کر سکتی کیونکہ یہ اندھیرے کا تعاقب کر رہے ہیں اور سورج اُن کی پشت پر غروب ہو رہا ہے!

میں نے دیکھا کہ اس مُلاں کٹ کی زندگی صحت کے سر سائے سے بدبختی ہے اور مشکلات کے سر موڑ پر بیٹھ جاتی ہے۔ وہ حق کا علم رکھتا ہے لیکن حقائق کی طرح پُرسکون زندگی کا عادی نہیں اور نہ مصائب سے نبرد آزمائی کا خوگر!۔

وہ مذہب کی رئی سے قوم کے خون کو بلو کر پی جانا چاہتا ہے۔ اس کا وجود اس کیکر کے درخت کی طرح ہے جو شاہراہ میں ہوا!

میں نے اندازہ کیا کہ اس کا جسم عیش پسندی کے باعث جیل خانے کی چہار دیواری سے خائف ہے وہ تو مساجد میں دوزخ کے پٹواری کی طرح اس کے طول و عرض پر گفتگو کرتا ہے اور شیطان کے اُستاد کی طرح اس کے

معائب اور محاسن سے آشنا ہے۔ اس کی روزمی میں دوزخ کی خیرات اور شیطان کے صدقہ کا بڑا دخل ہے۔

اسے پستی سے بلندی پر چڑھنے کے لئے زینہ نظر نہیں آتا اس کی بھول کی پینگ دُنیا کے اسی گوشہ کی طرف بڑھتی ہے جہاں بے پھل پھول کے خاردار درخت ہیں۔ اس کے روزہ دار دن اور نمازی راتیں ایک خواب میں جو جسمانی ناقوب اور گنہگارانہ سرسام کی تعبیر کہلائے جا سکتے ہیں۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ وہاں ہے جہاں قوم کے میلے کپڑے پڑے ہیں۔ اور نہ صابون ہے نہ پانی اسے کیا خبر کہ گندی کس طرح ہوتی ہے۔ اور کپڑے گھاٹ پر پہنچنے کا کیا وقت ہے کس کپڑے کو کون سا صابن اور کونسی بھاپ صاف کر سکتی ہے؟

اُس کے علم سے بصیرت کی کونپل نہیں پھوٹتی۔ کیونکہ اس کا رجحان تو اس طرف ہے جہاں سے عدل و انصاف رخصت ہو چکے اور بصیرت کا سوت بند ہے جہاں صرف جسمانیت کے سنگریزے ستاروں کی شعاعوں سے شمار رہے ہیں۔

اس کا حال دن کو اندھا رہتا ہے اور رات کی تاریکی میں آنکھیں کھولے بصیرت کی معزولی پہ ماتم کرتا ہے کیونکہ اس میں اتنی تاب نہیں کہ مستقبل کی جوت اور بلندی کو دیکھ سکے؟...

یہ کل کی بلندی سے جی چرا کر آج کے کھنڈر میں گم ہو جانا چاہتا ہے جہاں حرام خور پرندوں اور مردار خور پایوں کے علاوہ کا نس ہی گھاس ہے جہاں شیر نہیں رہ سکتا۔

یہ ایک بیداری میں تیرتی ہوئی غفلت ہے جو جاگتے ہوئے لوگوں کو دھوکے میں ڈال دیتی ہے اور کسی کو گمان بھی نہیں ہوتا کہ یہ ترقی یافتہ جانور ناپاکیوں، فریب بازیوں اور بے ایمانیوں کے بوجھ سے دبا ہوا ڈکرا رہا ہے۔ نہ کہ عقبیٰ کے خوف سے!

یہ اس معاشرہ سے دور آگیا جہاں دنیا کا خوف ہے نہ عقبیٰ کا غم بلکہ ہر انسان سر تا سر زندگی اور آسودگی ہے۔

یہ پیغمبرانہ قیادت قبول نہیں کرتا جو انقلاب کے ساتھ تاریخی رجحانات کو تبدیل کر کے نئی بنیادیں اٹھاتی ہے۔

اس کی روشنی دھوئیں سے نیلی پڑ گئی۔ اور اس کے عقائد کی بہار پر عفونتوں کا غلبہ ہو گیا۔ یہ اپنے روحانی میناروں کا راستہ بھول گیا اور بادشاہ کے نشیبوں کو مسکن بنانا چاہتا ہے۔ اس کی سیرت کی شفاف جھیلوں کو گندے نالوں نے خالی کر دیا۔ اب اس کی وسعتوں میں درزوں کے جال کے سوا کچھ بھی باقی نہیں یا پھر کائی کے سوکھے ہوئے ریشے جو نم آلود زمین سے لپٹے ہوئے ہیں۔ کیونکہ یہ صرف تنظیم مساجد اور تہذیب ائمہ کو ملک اور قوم کی تنظیم خیال کرتا ہے اور معاشی توازن پر نظر نہیں رکھتا۔

—— اس کی بلندیاں قوم اور ملک کے لئے جگہ جگہ ڈوک

بن کو رہ گئیں اور ایسے ڈوک کہ ایک کو دوسرے کی تاریک ضمیری شرمارہی ہے اور صداقت کی سربلند آواز ان کی تہ کو چھو کر واپس نہیں آتی۔

اس کے جبّہ اور دستار جہالت کے رگ و ریشہ سے بنے ہوئے ہیں جس میں شیطنت نے پان لگائی ہے۔

وہ آزاد فضا اور روشن ماحول میں سانس لینے والی مخلوق سے کتراتا ہے اور اُس دَور کی لاش کو الٹی ڈالے اُس پر بیٹھا ہے جس کی پشت سے یہ صادر ہوا ہے۔ اس کے سائے سے اس کی بیوی میں وہ صلاحتیں نہیں پنپ سکیں جن سے ذہین بچے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ عالم دیکھ کر میں گھبرا کے باہر نکل آیا اور ان غیر مذہبی صداقتوں پر عرصہ تک مشکوک نظریں ڈالتا رہا کیونکہ اندھا رستہ کبھی منزل تک نہیں پہنچا سکتا۔

یونہی پھرتے پھرتے میں ایک دن رو ٹرام گھاٹ کلکتہ پہنچا۔ ایک ملّاح ابھی ابھی پانی کاٹتا ہوا آیا تھا۔ اُسے اُونگھ آرہی تھی۔ وہ پلیٹ فارم پر سو گیا۔ میں اس کی گردن سے نیچے کے جسم میں داخل ہوگیا۔

میں نے دیکھا کہ وہ عموق کے ناپیدا کنار سمندر میں بہ رہا ہے اور اپنا بجرہ زندگی کے ہر نزدیکی جزیرہ پر اس خیال سے لگا دیتا ہے کہ شاید اس ہی میری محبوب جنس کے قدر داں مل جائیں جو اس نے روح کے کارخانے میں تیار کی ہے اور دل کے اسٹیشنوں پر اس شے لئے پھرتا ہے کہ آنکھوں والے بیوپاری خرید کر

ضرورت مند مخلوق تک پہونچادیں لیکن وہ لوگ اپنے اپنے مطلب کی چیزیں چھین کر لنگر کاٹ دیتے ہیں اور نیہ رگ میں دکھن لئے ہوئے ایک دندانہ دار سانس کھینچتا ہوا دوسرے نزدیکی جزیرے پر نظر جما دیتا ہے ۔ اور وہاں بھی یہی سلوک ہوتا ہے ۔

لیکن دور ان ساحلوں کے چھوٹے جزیروں سے بے تعلق بہتے ہوئے دھوئیں کی ایک وادی ہیں کچھ شعلے سلگ رہے ہیں اور وہیں سے اس سمندر کے وسیع تہ خانے میں راستہ جاتا ہے ۔ یہاں تبسّموں کی کاشت ہوتی ہے اور درختوں پر پتّوں کی جگہ قہقہے لگتے ہیں ۔

وہاں دلوں کے زخموں اور روحوں کے ناسوروں کے لئے ہسپتال ہیں ۔ نگاہوں سے نبض دیکھی جاتی ہے اور تبسّموں سے علاج کیا جاتا ہے ۔ یہاں نہ تو ناکامیوں کے خشک ٹیلے ہیں اور نہ پیاس کے سوکھے ہوئے بوڑھے غار لیکن یہ ابھی وہاں اپنی کشتی کو لے جانا نہیں چاہتا ۔

اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ ملّاح جس کے سر میں پر لگے ہوئے ہیں خواب سے پلٹ رہا ہے ۔ میں باہر آگیا اور خراماں خراماں سوچتا ہوا چل دیا کہ آخر موت اور زندگی کا کیا گورکھ دھندا ہے جس سے کسی کو نجات نہیں ۔ کئی دن اسی ادھیڑ بن میں گزر گئے ۔

(۵)

ایک دن ایک اوچھے ایڈیٹر کو سوتا دیکھ کر میں نے اس کے سینے کا دروازہ کھولنا چاہا مگر شرحِ صدر نہ ہونے کے باعث وہ زنگ آلود ہو چکا تھا۔ میں نے اس کی باچھیں کھولیں اور تالو سے اُتر گیا۔ اس نے اپنی الماریوں میں مختلف مصنفین اور فاقہ کش ادیبوں کے اُگلے ہوئے لقمے چاندی سونے کے ورق لگا کر سجا رکھے تھے۔ میں نے دیکھا اس کی نظر متعفن زخموں اور نئے ناسوروں کے سوا تمدن کے کسی شعبہ پر نہیں پڑتی۔ اس کا دل شکم پرور ہے اور دماغ غلامی کا نمک خوار وہ دُنیا کے مصائب سے اپنے اخبار کی حرّوں میں سنہری پانی دیتا ہے اور کم سوار لوگ اسے ایک لمحہ کے لئے سامانِ تفریح سمجھ کر رہ جاتے ہیں اس کے قدم کبھی عبادت گاہ کی طرف نہیں اُٹھتے۔ وہ موت کے خیال سے خائف ہے اور موت اس کے مکان کے مختلف گوشوں سے اس کی گھات میں لگی ہوئی حکم کی منتظر ہے!

اس کی امیدیں لوگوں کی مایوسیوں سے بارآور ہوتی ہیں اور اس کے مسروقہ مضامین وقتاً فوقتاً اہلِ علم میں غمازی کرتے رہتے ہیں۔ وہ صحافت کے جسم پر خارش ہے جو علاج سے بڑھتی ہے!

اس کے یہاں حرام و حلال، اور جائز و ناجائز میں لمبا چوڑا فرق نہیں اس کے

جبڑے حرام گوشت سے انکار نہیں کرتے۔ وہ قوم فروشی کے ساتھ ساتھ ضمیر فروشی کا بھی ماہر ہے اور صاحبِ ضمیر لوگوں پر اپنی فوقیت کو روا خیال کرتا ہے اس کے جلو میں ریڈیو کے ذلیل اراکین بھی دیکھے گئے۔ جو پراپیگنڈہ کے بل پر زندہ ہیں اور جن سے جوہرِ قابل دُور جا چکے ہیں۔ وہ ایڈیٹروں۔ پراپیگنڈسٹ ادیبوں اور غل غپاڑہ مچانے والے جعلی شاعروں کو پروگرام کے ٹکڑوں سے خاموش کر دینا جانتے ہیں اور یہ رویّہ غلط لوگوں کو سرکشی کے رستہ پر ڈال رہا ہے!

زنجیروں کے چمکتے ہوئے ڈھیر دیکھ کر اُسے غلامی گدگدا دیتی ہے۔ اور شہرت کا اشارہ پا کر قوم اور ملک کو غلام بنانے پر تُل جاتا ہے اسے لوگوں کے شجروں اور ذاتیات کا جنون ہے۔ یہ پہلی ملاقات میں اپنی کھوکھلی معلومات کا ذخیرہ ڈھیر کر دیتا ہے اور یہ نہیں جانتا کہ یہ معیارِ قابلیت تیسرے درجے کے انسانوں کا ہے۔

جب کوئی اُس سے بڑا ریاکار اس سے متعارف ہوتا ہے تو اس کی گفتگو کا سلسلہ اٹک اٹک کر چلنے لگتا ہے اور الفاظ میں مری پھیل جاتی ہے کیونکہ یہ تو ایسا خشک جنگل ہے کہ برساتی پانی سے اس کی زمین میں گھاس تو اگ آتی ہے مگر درخت نہیں اُگتا۔ اور کہیں کہیں کوئی درخت ہوتا بھی ہے۔ تو صرف ایسا کہ جس کی جڑیں صرف اسی کی داڑھوں میں پھیلی ہوئی ہیں جو حلق

سے اُتر کر بیننے کو گھیرنے والی جڑوں کے خوشبو دار درخت اُسے نصیب ہی نہیں۔

اس کا مبلغ علم بھوسہ کا ڈھیر ہے جس میں ایک بھی دانہ نہیں ہوتا یہ تو بھوروں میں زندگی گزارنے اور گوبر بیچ کر روزی پیدا کرنے والی مخلوق سے ہے جسے بھولا ہوا اتفاق یہاں چھوڑ گیا!

اس کی زندگی ایک اوباشوں کی اصطلاح ہے جو شرفاء میں استعمال ہی نہیں ہوتی یہی وجہ ہے کہ اخبار کے اڈیٹر کا کوئی دوست نہیں ہوتا جو اس پر اعتبار کر کے اس کے سامنے زندگی کو بے نقاب کر دے کیونکہ یہ طبقہ دوستی کے معاملے میں اعتبار کے قابل نہیں ہوتا۔ ان میں درندوں کی سی دوستی کامیاب ہوتی ہے اور یہ آنکھیں رکھتے ہوئے بھی دوستوں سے بچھو کا سا سلوک کرتے ہیں!

اس کے منجھلے بھائی پریس کی اصلاح کو عوام کی اصلاح سے تعبیر کرتے ہیں حالانکہ ملک اور قوم کے عوام کی اصلاح کا دیباچہ معاشی انقلاب سے شروع ہوتا ہے اور معاشی انقلاب کے لئے ایسی بصیرت کی ضرورت ہے جو حال کے خدوخال پر کڑی تنقید کر سکے۔

یہ غرانا بھی جانتا ہے اور مسکرانا بھی۔ پنجے بھی مارتا ہے اور تلوے بھی چاٹنے لگتا ہے۔ لیکن یہ سب بھبکی کی نوعیتیں ہیں۔ یہ کسی عالم میں آنکھیں

ملا کہ بات نہیں کرتا بلکہ تعلّق اور بے تعلقی کے درمیانی رشتے تلاش کرنے لگتا ہے یہ تو اس جماعت کا ایک فرد ہے جو اپنی ناجائز اولاد کو بیچتا اور ڈھکڑ کہ قیمت بڑھاتا ہے اس سے تو وہ لوگ غیرت مند ہیں جو لکڑی کا گشتہ لئے در در مانگتے پھرتے ہیں!

یہ اپنی عزت گم کر چکا اور اب دوسروں کی عزّت کا جائزہ لیتا رہتا ہے نہ اس کا کوئی کیریکٹر ہے نہ رائے نہ یہ خود کو جانتا ہے اور نہ دوسروں کو پہچان سکتا ہے۔ اس کے لئے دل کا ہر دروازہ بند اور آنکھوں کا ہر پردہ کھنچا رہتا ہے۔ یہ راستے میں لوگوں کو خود متوجہ کرتا ہے اور ہمسفروں کو بھی بتا دینا چاہتا ہے کہ میں ایڈیٹر ہوں اور ایک اُردو روزنامے کا! یہ نہیں کہتا کہ میں کمینہ ہوں اور ایک بے انصاف کے رحم و کرم پر زندگی بسر کر رہا ہوں۔ اس منظر سے میرا دم گھٹنے لگا۔ اور دوڑ کر دماغ کے راستے نکل آیا!

○

# تحریک

تحریک کسی مقصود کو حاصل کرنے کے لئے ایسی منظم اور اجتماعی جد وجہد کا نام ہے۔ جس میں مقصد اور اس کے حصول کی لائحہ عمل کے پیش نظر اقدام کیا گیا ہو!

ہر تحریک کی کامیابی اس کے مقصد کے قابل حصول اور لائحہ عمل کے نتیجہ خیز ہونے میں ہے۔ تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تحریکوں کی ناکامی کا باعث ہمیشہ یہی رہا ہے کہ شعور کے افلاس سے مقصد میں نقائص اور مقصدی نقائص سے لائحہ عمل میں اغلاط تولد ہو گئے جس سے تحریکوں کے جسم میں زہر پھیلتا رہا۔ اور وقت سے پہلے غروب ہو گئیں۔

ہر تحریک میں جس قدر اور جب تک مخلص اور بیدار دماغ لوگوں نے کام لیا ہے۔ ان کی روحوں کی آگ اور شعور کی بجلی ان کے عمل میں کار فرما رہی؟

اور تحریک نے کبھی راستوں کے سنگلاخ نشیب و فراز کو دیکھ کر جی نہیں چھوڑا لیکن جب مخلص اور صاحب فکر اراکین نہ رہے تو تحریک بھی اُسی رفتار سے بے عمل، غیر دلچسپ اور بے نتیجہ ہوتے ہوتے الوپ ہو گئی۔

کسی تحریک میں پہلی شرط حریفوں سے ٹکراؤ نہیں ہوتا بلکہ اپنی تحریک کی طاقت اور حفاظت کا خیال ہوتا ہے۔ جس کے عمل کا ظاہر معتدل اور باطن شدید ہونا ضروری ہے اور جب اعتدال شدت اور شدت اعتدال کی صورت اختیار کر کے اُسے زندگی کا نام دے دے تو خود بخود چھیڑ چھاڑ سے ٹکراؤ لازمی ہو جاتا ہے۔ صاحبان نظر کبھی اوچھے ٹکراؤ کے قائل نہیں ہوتے۔

جس تحریک کا محرک بالغ نظر، ایمان دار اور مخلص ہوتا ہے۔ اس کے سائے میں روحیں ایسی تہذیب اور اجسام ایسی تعلیم پاتے ہیں۔ کہ ان کا کوئی عمل نتیجے سے خالی اور فکر حقائق سے دُور نہیں ہوتا۔ ان کی زندگی کا ہر عمل ضمانت ہوتا ہے خیر اور نیکی کی!۔

جس تحریک کا بانی روشن خیال ہو اور مخلص عافلہ کے سلجھے ہوئے دماغ کھلی فضا میں سانس لے رہے ہوں۔ ان کی رفتار میں سنجیدہ اعتدال ہوتا ہے جس سے حوصلے بلند اور ولولے برانگیختہ مگر احتیاط کے بڑے اونچے رہتے ہیں۔ اور جب تک بلیک پرواز منزل تک پہنچنے کی طاقت پر پورا بھروسہ نہ ہو جائے۔ زمین سے بلند اور شاخوں سے اونچے نہیں اُٹھتے!۔

جس تحریک میں اراکین بست و کشاد حال کی کھڑکی سے سر نکال کر مستقبل سے بات نہ کر سکیں وہ تحریک ناقص ہے۔ صحیح تحریک میں تو ایسے ہی جہاں چاک نظر والے انسان ہوتے ہیں، جو نقش قدم سے مسافر کا ارادہ اور ذرہ کی روشنی سے سورج کے ضمیر کا مطالعہ کر لیں۔

اُن افراد کا یہ کام ہوتا ہے کہ پانی کی بوند کی لرزش سے طوفان کی جلال اور برف پر انگلی رکھ کر بجلی کے مزاج سے اجتماع کو آگاہ کریں۔ ہر مصیبت کا سدِ باب ان سے پہلے ہی سے متعارف ہو اور خندقیں کھودتے وقت مزدوروں کے ساتھ پسینے میں شرابور اور زخم کھاتے سپاہیوں کے ہمراہ خود بھی لہولہان نظر آئیں۔

O

# شکار

**بٹیر** ، کا شکار کرنا ہو تو صبح صادق سے پہلے گلابی چاندنی میں بستر کو طلاق دے دے اور ایک بولنے والا بٹیر لے جا کر جنگل میں رکھ دے، بٹیروں کے جنگل میں۔ پھر وقت کی ٹھنڈی سانس میں گرم ٹٹکاری آمیز کر کے آواز دے اور جال کی رسّی کھینچے رکھ تیرے نمک خوار اور پالتو بٹیر کی آواز پر بہت سے بٹیر آجائیں گے جو حال اور مستقبل سے بے خبر ہیں۔ پکڑتا جا، اور خیال رکھ! کہ زیادہ بولنے والا کونسا ہے، تاکہ پھر تیرے شکار میں معاون ہو سکے۔

متقرّبی تو جان ہوتا ہے ناقص حکومت کے قیام کی!

**لنگور**، کا شکار مقصود ہے تو اس کے لئے دو ہی وقت موزوں ہیں۔ دوپہر یا چاندنی۔ لنگور ہمیشہ اپنے سائے پر نظر رکھتا ہے، چیتا ہمیشہ چھپ کر اس کے سائے پر حملہ کرتا ہے

اور یہ اپنی ہلاکت کا یقین کر کے درخت سے نیچے آگرتا ہے۔

زبوں کار اور روسیاہ انسان کی حیات و موت کا دارومدار بھی اُس کے جرم و گناہ پر ہوتا ہے اور اُس کے اس محبوب اثاثہ کا نقصان اُس کی زندگی کا نقصان ہے۔

**کوّا۔** کوّے کا شکار مقصود ہے تو نرسلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ایک ڈورے میں پرو کر انگلی کی طرح کھینچ کر باندھ دے اور اُسی میں گوشت کا ایک ٹکڑا لٹکا دے۔ کوّا جب اُس نرسل کے ٹکڑوں والی رسی پر بیٹھے گا تو گھوم جائے گا اور پنجے اُوپر ہو جائیں گے۔ اب موت کے خوف سے وہ اُس رسی کو پکڑے رہنے پر مجبور ہوگا۔

یہ کوّے پر ہی منحصر نہیں ہر حرام خور کی اچھل کود، پرواز اور سیانپت بنیادی سہارے کے بغیر نہیں ہوتی اور زیرک شکاری کے لئے وہی سہارا شکار کا آلہ قرار پاتا ہے۔

**ہرن۔** کے شکار کے لئے تیر و تفنگ کی ضرورت نہیں، رات کو دو اینٹیں لے کر اُن کے رمنہ کے قریب چھپ کر بیٹھ جاؤ، اور جب وہ آرام کریں تو وہیں بیٹھے بیٹھے ایک بار اینٹ پر اینٹ مار دے تاکہ وہ چوکنے ہو جائیں۔ کچھ دیر بعد جب وہ مطمئن ہو جائیں اور آرام کرنے لگیں تو پھر اینٹ پر اینٹ مار کر چونکا دے اور صبح تک یہی عمل کرتا رہ۔ ضرورت صرف اس خیال کی ہے کہ وہ

جگالی نہ کرنے پائیں۔ بسیار خور چوپایہ جگالی کے بغیر اپھر کر رہ جاتا ہے
اسی طرح ہر ی جگ قسم کا چالاک اور تیز و طرار انسان
شب بیداری اور بے آرامی کی زد پر آکر شکار ہو جاتا ہے

**خرگوش** ۔ کے شکار کے لئے رات کو ایک ہنڈیا میں
بیس پچیس سوراخ کر کے اس میں کاٹھی کی آگ بھر لے اور ایک بانس
کے بیچ میں چھینکے کی طرح باندھ لے اور بانس کا ایک سرا خود لے کر
اور دوسرا کسی دوسرے آدمی کو دے کر ہلاتا ہوا چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں
سے گذرے۔

ہر خرگوش سوراخوں سے چمکتی ہوئی آگ کو خرگوشوں کی آنکھیں
سمجھ کر لپکے گا۔ بس جو نزدیک آتا جائے لکڑی مار کر گراتا جا۔

سادہ خاطر لوگوں کو بھی جعلی پیر اسی طرح شیطانی شعبدے
دکھا دکھا کر شکار کرتے ہیں اور وکیلوں کے منشی مقدمات
کی کامیابی کے جھوٹے خوابوں سے جاہلوں کو ہلاکت سے
دوچار کرتے ہیں!

○

# غدّاری!

اس دور میں غداری اپنا لغوی ، اخلاقی اور نفسیاتی مفہوم کھو چکی ہے اب وہ صرف ایک خیال ، آواز یا حرکت ہے اپنے سیاسی حریف کے خلاف ۔

دوسرے ملکوں کی نسبت ہماری اپنی زندگی میں غداری کے تماشے زیادہ نظر آتے ہیں اور ایک حساس انسان یہ سوال کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ آخر ہمیں یہ کیا ہو گیا کہ ایمان کمزور اور اخلاق بودے پڑ گئے کیا ہم صدیوں سے اخلاق اور مذہب کی سرد تختی ہی کر رہے ہیں ؟ مگر اس برِ اعظم میں تو یہ سوال بھی غداری میں شمار ہوتا ہے اور غالباً یہی سبب ہے اخلاق کے نیچے پر اس سیاسی بھوڑے اور مذہب کی گدی پر اس اشتراکی دُنبل کا ۔

آج تو ایک غیر اخلاقی ، رجعت پسند ، خود غرض اور ایثار و عمل سے عاری دَور کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے والوں کو بھی ۔

غداروں کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے اور غداری کی سزاؤں پر وہ لوگ مقرر ہیں جو ان سے زیادہ اخلاق سوز، بھیانک اور ظالمانہ جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ کیا اسے بھی وفاداری کہا جائے گا؟ کیا یہ لوگ اخلاقی اور سیاسی مجرم نہیں؟ کیا یہ اپنی اصل غداری کو وفاداری کا لقب دے کر اپنے مفاد کو پورا نہیں کرتے؟

جب غداری اخلاقی اور سیاسی اصطلاح سے ہٹ کر غلط روی اختیار کرتی ہے تو حریفوں کے بازاروں میں بددیانتی اور بے ضمیری ارزاں ہو جاتی ہے اور پھر ہر شخص اپنے مفاد کے تحت خود فروشی اور ملت آزاری کو طرۂ امتیاز گردان لیتا ہے جس سے وفاداری کی اخلاقی فضیلتوں کے بارہ میں یقین متزلزل اور عمل مردہ ہو جاتا ہے۔ اور اس جذبہ کے سوا کوئی جذبہ سربلند نہیں ہوتا کہ ذاتی پرخاش اور حریفانہ چپقلش کے تحت صاحبان حق کا مذاق اڑایا جائے اور صداقتوں پر دھول ڈالی جائے!

O

# موت

ماضی کا جلوس بہت دُور جا چکا اور حال کا اسٹیشن ویران نظر آرہا ہے۔ تھکی ہوئی زندگی کبھی کبھی موت کا رستہ روکنے کی ناکام کوشش کر رہی ہے مگر دنیا کی خود غرضی، بے پروائی اور بے گانگی سے اُکتائی ہوئی رُوح اس کا ہاتھ جھٹک دیتی ہے۔

آنے والے وقت کے اندازے بڑھتے جا رہے ہیں مگر کسی نظریہ پر یقین تصدیق کی مہر ثبت نہیں کرتا۔

ہوش و حواس بے ہوشی کے منڈیر پر جانے کے لئے پر تول رہے ہیں۔ اُن کے پروں کی ٹھنڈی ہوا سے پسینہ خشک ہو جائے گا۔ اور مجھے نیند آجائے گی۔ چاہتا ہوں کہ سب کو خدا حافظ کہہ دوں مگر زندگی اہل و عیال کے چہروں پر نظر جمائے رحم کی طالب ہے۔ بے وفا، اور مجبور لوگوں سے ۔ کاش یہ بھیڑ چھٹ جائے اور مجھے راستہ مل جائے اب نہ بھوک ہے نہ پیاس ہونٹ تر ہیں اور معدہ سیر، کامشی۔

کاش رُوح سے جلد از جلد عناصر کا لیپ اُتر جائے اور میں تندرست ہو جاؤں اور ساتھ ہی قابل پرواز۔

اب وہ بزرگ اور محترم لوگ آگئے ہیں کل تک جن کے مزارات سے متعارف تھا اور دنیا کے کاروبار سے تھکے ہوئے جسم کو لے جا کر ان کی خانقاہوں میں ڈال دیتا تھا اب شاید میں ہمیشہ انہیں کے ساتھ رہوں گا اور مستقبل میں امن و سکون میسّر آجائے گا۔ مجھے ان کے سانسوں سے ٹھنڈی خوشبو آرہی ہے اور میں تحلیل ہوا جا رہا ہوں جیسے میرے جسم سے بھاری لبادہ اُتر رہا ہے۔ میرے ہاتھ پاؤں غیر مرئی ہو رہے ہیں۔ اب میں زندگی سے خائف ہوں موت سے نہیں۔

اس وقت یہ حسرت ضرور ہاتھ مل رہی ہے کہ کاش میں اپنے انسانی عقیدے تقسیم کر سکتا۔ اور دُنیا کو سمجھا سکتا کہ جو خدا بن کر انسان کی خدمت کرتا ہے وہ کٹھنائی کی راہ طے کرتے ہوئے دُنیا سے ٹھوکریں نہیں کھاتا۔

سب لوگ اپنی اپنی آرزو کی طرف بڑھ رہے ہیں لیکن کسی کی آرزو موت کے اُس پار ہے اور کسی کی اس پار۔

جو آرزو مند اس راستے میں آسائشوں کے بار سے دبے ہوئے ہیں ان کے کندھے نیلے پڑ گئے اور پاؤں پر ایسا ورم آگیا ہے، کہ اسے دبانے سے دیر تک سطح برابر نہیں ہوتی اور یہ بارگراں سفری لوازمات میں ناروا اضافہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ یہ بوجھ کندھے پر

موزوں ہے نہ سر پر!

دین سے دوری اور خود سے مہجوری موت کے خیال کو بھیانک بنادیتی حالانکہ زندگی تو ایک روشنی کا منارہ ہے موت کی راہ میں، جہاں سے منزل کی راہ اور راہ کے آثار نظر آنے لگتے ہیں۔

انسان اُسی چیز سے زیادہ ڈرتا ہے جس کے متعلق وہ علم نہیں رکھتا اور یہی لاعلمی ہے جو اُسے بعض اوقات خودکشی پر آمادہ کردیتی ہے۔ خودکشی کرنے والے کے احساسات مفلوج اور شعور مخبوط ہوتا ہے وہ دنیا اور زندگی دونوں کے متعلق کوئی علم نہیں رکھتا اس میں بزدلی اور کم ہمتی کے خیالات میلہ لگادیتے ہیں جس میں نہ تو زندگی کی مجرّد اہمیت کوئی تماشا دکھاتی ہے اور نہ زندگی کی مقدس وسعتیں دکانیں لگاتی ہیں جس سے رُوح وجسم کا مشترکہ عمل نہ تو زندگی کی حفاظت کرتا ہے اور نہ تصور کُلّی کی نہ اہتمام کا شوق طلوع ہوتا ہے نہ احترام کا جذبہ!

امانی شاہ کا خیال ہے کہ جس چیز سے پُوری طرح تعارف نہ ہو اس سے خوف کوئی معنی نہیں رکھتا اوراس کا یک رُخہ مطالعہ اور تصور لاعلمی کی دلیل ہے جو خود اپنی سزا ہے۔

اب لوگ یہ بھول چکے ہیں کہ جانکنی سے بچنے اور موت سے محفوظ رہنے کا واحد علاج شہادت ہے!

احسان دانش

# ماخذِ طبقات

| | |
|---|---|
| خیالات عالیہ | از محمد نجم الغنی قریشی |
| طلسم عمل | از نسیم رضوانی صاحب |
| مقدمہ مابعد طبعیات | مترجمہ مولوی عبدالباری صاحب |
| مکالمات افلاطون | مترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب |
| مشاہیر یونان و روما | |
| آوارہ | از خلیل جبران مترجمہ پیر عبیدی |
| حکمۃ الاشراق | مولوی مرزا محمد ہادی صاحب |
| رسالہ الہلال | از مولانا ابوالکلام آزاد |
| شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک | از پروفیسر محمد سرور |
| طریق و تفکرات | از ڈیکارٹ مترجمہ مولوی عبدالباری ندوی |
| نغمۂ خداوندی (گیتا) | از محمد اجمل صاحب |
| مسائل حیات | از خلیل جبران مترجمہ خلیل صحافی |
| نفسیات زندگی | از شیر محمد اختر |
| اشارات | از جوش ملیح آبادی |
| استبداد | مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی |

| | |
|---|---|
| بقول زردشت | از نطشے مترجمہ ڈاکٹر ابوالحسن منصور پروفیسر مسلم یونیورسٹی |
| نظریہ خدا وغیرہ | از ڈانٹے (جہنم) حصہ اول مترجم عزیز احمد صاحب بی۔ اے آنرز (لندن) |
| ریاست | از افلاطون مترجمہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب |
| فہم انسانی (ڈیوڈ ہیوم) | مولانا عبد الباری صاحب |
| مخزن اخلاق | از مولانا رحمت اللہ سبحانی لودیانوی |
| نظریہ خیر و شر | مترجمہ خواجہ عبد القدوس صاحب ایم اے |
| نامہ خسرواں (قدیم تاریخ ایران) | مطبوعہ ایران |
| مذہب اور باطنی تعلیم | از مرزا محمد سعید صاحب دہلوی |
| ٹوٹے ہوئے پر | از خلیل جبران مترجمہ حبیب اشعر دہلوی |
| آنسو اور مسکراہٹ | " " احمد محمود انور |
| توقیعات کسریٰ | (اقوال شاہان ایران) |
| فطرت انسانی | سید اسد اللہ بی۔ اے |
| شہنشاہیت | مظفر خاں صاحب ظفر یوسفی |
| آزادی (جان اسٹورٹ مل) | مترجمہ مولوی سعید انصاری بی۔ اے۔ |
| بنفشہ کا پھول | از جبران مترجمہ حبیب اشعر صاحب دہلوی |

| | |
|---|---|
| مبادیٔ علم انسانی | برکلے مترجمہ مولوی عبد الماجد بی اے |
| رسالہ نگار لکھنؤ | مدیر نیاز فتحپوری |
| نفسیات مذہب | سید وہاج الدین بی اے۔ بی ٹی |
| رازِ قدرت | سید قمر الزماں صاحب |
| مقصدِ زندگی (الفرڈ اڈلر) | مترجمہ سید محمد حسین جعفری بی اے |

اُردو زبان میں تحقیق و تدقیق کا لازوال

شاہکار

# لغات الاصلاح

از احسان دانش

اس کتاب میں اُردو زبان کے اُن پانچ ہزار غلط الفاظ کی تحقیق و تصحیح ہے جو روزمرہ محاورات اور تحریر و تقریر میں مستعمل ہیں۔

قیمت ساڑھے چار روپے

مکتبۂ دانش ایبک روڈ انارکلی لاہور

زندگی کبھی افسانہ بن جاتی ہے اور کبھی افسانہ زندگی بن کر رہ جاتا ہے آیئے

## افسانہ

# زندگی کے جائزے

دیکھ کر غور کیجئے کہ آپ جسے افسانہ کہتے ہیں وہ تخیل کی پیداوار نہیں ہے بلکہ آپ کی اور آپ کے پاس پڑوس کی اور آپ کے گرد و پیش کی جیتی جاگتی، ہنستی کھیلتی، بولتی چالتی تصویریں ہیں۔ جن کو سید ابوسعید بزمی ایم اے کے تخیل نے نہیں تجربہ اور مشاہدہ کی دوربین سے الفاظ کا جامہ پہنا کر کاغذی پردے پر اتار دیا ہے۔ آپ انہیں دیکھیں گے اور دوسروں کی نہیں خود اپنی زندگی میں کھو کر رہ جائیں گے۔ ان میں نام اور مقام سب فرضی ہیں لیکن واقعات فرضی نہیں۔ اگر آپ کے پاس فلسفۂ اخلاق، تاریخ اور مذہب کی دس پیچیدہ کتابیں پڑھنے کی فرصت نہیں ہے تو اڑھائی سو صفحے کی اس شگفتہ زبان میں لکھی ہوئی زندگی کے افسانوی قالب کا صرف پہلا صفحہ پڑھئے اور دیکھئے کہ پھر آخری صفحے تک کتاب آپ کے ہاتھ سے چھوٹتی ہے یا نہیں۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے ؏۲

مکتبۂ دانش مزنگ لاہور

اُردو کی ایسی کتاب جو ادیبوں، شاعروں، کلرکوں، تاجروں، استادوں اور طالبعلموں کے لئے یکساں مفید ہے

# دستورِ اُردو

(از احسان دانش)

اس کتاب میں اُردو نثر کے ان تصنیفی و تالیفی کارناموں اور روزمرہ کے ان اغلاط کی اصلاح ہے جو تقریر و تحریر کے طول و عرض پر حاوی ہیں اور زبان و قلم کی ہر سعی کو معیار فصاحت سے گرا دیتے ہیں۔

دستورِ اُردو میں ان خامیوں اور کوتاہیوں پر نظر ڈالی گئی ہے جو ہماری بول چال اور مجلسی گفتگو میں پائی جاتی ہیں اور جنہیں عوام تو عوام خواص بھی قابل اعتنا نہیں سمجھتے۔

اصول و قواعد کی روشنی میں صحیح اور غلط کو پہچاننے اور فصیح و غیر فصیح کا معیار قائم کرنے کے لئے اُردو دنیا میں اب تک اس سے بہتر کتاب موجود نہیں ہے۔ قیمت صرف دو روپے

**خضرِ عروض** جناب احسان دانش کی یہ کتاب علم عروض کی اُن باریکیوں اور پیچیدگیوں کا حل ہے جن میں مبتدیاں شاعری بھٹکتے رہتے ہیں۔ اس کے مطالعے سے معمولی تعلیم یافتہ انسان بھی مشکل سے مشکل بحر کی تقطیع کر سکتا ہے۔ قیمت صرف آٹھ آنے

# احسان دانش کے منظوم شاہکار

نوائے کارگر۔ چراغاں۔ آتش خاموش۔ جادۂ نو۔ زخم و مرہم۔ مقامات۔ گورستان۔

۱۲؍ ۱۲؍ ۸؍ ۱۲؍ ۱۲؍ ۲؍ ۱۲؍

**روشنیاں**:۔ احسان دانش نے اس کتاب میں انسانی فلاح کیلئے وہ وہ زرین اقوال درج کئے ہیں جو قدم قدم پہ زندگی کیلئے چراغ راہ کا کام دیتے ہیں، حقائق و معارف، اخلاق و معاشرت، حسن و عشق، نشاط و غم، دوستی و دشمنی اور جنسی تعلقات پر شاید ہی کسی کتاب میں ایسے اقوال نظر سے گذریں۔ یہ مؤلف کی زندگی کا تجربہ، مطالعہ اور مشاہدہ ہے۔

قیمت ڈیڑھ روپیہ

**تحریر قدرت**:۔ یہ علم قیافہ کی وہ لاجواب کتاب ہے جس میں عربی، انگریزی اور سنسکرت کی قدیم و جدید کتب سے مدد لیکر سر سے پاؤں تک ہر عضو کی ساخت سے از روئے قیافہ شناسی خواص و نتائج نکالے ہیں اور تصاویر کے ذریعہ سے سمجھایا گیا ہے۔

قیمت صرف ایک روپیہ

**واردات** اردو ادب سے لگاؤ رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی کون ہیں؟ اور انہوں نے اردو نظم و نثر پہ کیا کیا احسانات کئے ہیں۔ واردات انہیں کے منظوم کلام کا مجموعہ ہے جسے گذشتہ نصف صدی کی اردو شاعری کے ارتقا کی مختصر تاریخ کہنا مبالغہ نہ ہوگا۔ بڑے سائز کے ۱۵۰ صفحات مجلد قیمت ۳؍

مکتبۂ دانش ایبک روڈ انار کلی لاہور۔

از ادیب شہیر جناب مسعود جاوید

## خوابوں کے ویرانے

جدید افسانوی رعنائیوں کا سرمایہ مفید اور معیاری ادب کا قابل مطالعہ شاہکار جس کے اسلوب بیان کا اچھوتا پن ہر افسانے کو فقرے فقرے پر دلچسپ بناتا چلا گیا ہے، پھر عریانی اور فحاشی کے بدبودار دھبوں سے بھی پاک رہا ہے۔ قیمت دو روپے (عہ)

از جناب مسعود جاوید

## چاندنی کے سائے

ادبی اور افسانوی خطوط کا مجموعہ جو اپنی نوعیت اور تحریر کی دلچسپی کے باعث ہر بلند ذوق آدمی کیلئے ایک خاص اور جدا عظمت و معیار کا حامل ہے۔ قیمت دو روپے۔ (عہ)

از سید جمیل واسطی ایم اے (کینٹب)

## اسلامی روایات کا تحفظ

اس کتاب میں مسلمانوں کے موجودہ دور کی تمدنی تشریح ہے جس سے قوم کے امکانی عروج و زوال اجاگر ہوتے ہیں۔

اس کتاب کا مطالعہ ماضی کی روشنی میں مستقبل کے خدوخال کو ابھاریگا۔ فاضل مصنف نے اپنی تحقیق و تجسس سے اسلامی معاشرت تہذیب اور سیاست کے ان پہلوؤں پر بحث کی ہے جو یا تو تاریک و مسخ ہو چکے ہیں یا تباہی اور تخریب کی زد پر ہیں یقین کامل ہے کہ یہ کتاب ہر لائبریری اور مسلم ادارے میں قدر و منزلت کی نظر سے دیکھی جائے گی۔ قیمت سوا دو روپے عہ٭